



تاریخ اسلام

عہد جاہلیت سے عہد نبوی تک

پروفیسر محمد یسین مظہر صدوق



199490
DATA ENTERED

تاریخ اسلام

عہد جاہلیت سے عہد نبوی تک

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی

فیکٹ پبلیکیشنز

14/B علی پلازہ سیکنڈ فلور ٹیمپل روڈ لاہور فون: 042-6374538

Web site: www.factpublications.com

Email: factpublications@fact.com.pk

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی حصہ ناشر کی پیشگی اجازت کے بغیر شائع کرنے کی اجازت نہیں، ماسوائے تبصرہ کے، جس کے ساتھ مصنف، پبلشر، مترجم، کتاب کا نام اور صفحہ نمبر تحریر کرنا ضروری ہے۔

29 ± 9
۳ ۶ ۲ ۵ ۹

کتاب : تاریخ اسلام (عہد جاہلیت سے عہد نبوی تک)

مصنف : پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی

ایڈیٹر : وسیم شیخ

کمپوزنگ : محمد حبیب

ڈیزائن : محمد اعظم

سن اشاعت : اگست 2008ء

قانونی مشیر : تیموری لاء ایسوی ایٹس

13 فین روڈ لاہور فون 042-7323202

قیمت : Rs: 200/

FACT PUBLICATION is a department of the Fact group of publications. Its objective to promote creative work by book publishing. The group proude on supremacy in all fields, vast readership, credibility and symbol of positive journalism. If you Want to read group others Publications, click on www.fact.com.pk

فہرست

صفحہ نمبر	ترتیب	
5	عرض اولیں	☐
9	مقدمہ	☐
19	جانبی عرب	☐
29	قدیم عرب سلطنتیں	☐
37	عربوں کا قبائلی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام	☒
50	مکہ اور قریش کا خاص مقام	☐
59	جانبی تمدن	☐
66	عہد نبوی کی حیات طیبہ کا اولین دور	☐
77	مکی حیات طیبہ کا دوسرا دور	☐
87	بعثت نبوی	☐
99	مخالفت حق	☐

۲۰۱۱

116	حیات نبوی کا دوسرا دور	□
125	اسلامی معاشرہ اور ریاست کی تشکیل	□
137	اسلام اور اسلامی ریاست کا عروج	□
149	اسلامی ریاست کا نظام حکومت	□
158	فوجی اور مالی تنظیم	□
168	مذہبی نظام	□
173	اسلامی معاشرہ اور سماجی اصلاحات	□
185	اسلام اور اسلامی شریعت کی تکمیل	□
193	حیات طیبہ کے آخری برس	□
195	ازواج مطہرات	□
200	سیرت طیبہ پر ایک مجموعی نظر	□

عرض اولین

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَلِلصَّلَاةِ وَالسَّلَامِ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ
وَعَلْفَاةٍ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ۔

اسلام تاریخ اور اسلامی تہذیب پر الگ الگ ہزار ہا کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لکھنے والے دو طرف کے ہیں: مسلم مورخین و مؤلفین جو اسلامی تاریخ و تہذیب کو بالعموم واقعات و حوادث کی کھتونی سمجھتے ہیں اور اسی حیثیت سے ان کو زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ وہ واقعات و حادثات کا تجزیہ و تحلیل نہیں کرتے اور نہ عہد زیر قلم کی بازیافت کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ جدید تاریخ نویسی کے اصولوں سے ناواقف ہوتے ہیں اور بالعموم تاریخ داں ہوتے ہی نہیں۔ دوسری قسم غیر مسلم مورخین کی ہے جن میں جدید مشرقی اہل علم اور مستشرقین دونوں شامل ہیں ان میں سے بیشتر اسلامی تہذیب و تمدن کے اصل مآخذ سے واقف نہیں ہوتے اور متعدد تاریخ نویسی کے اصولوں سے بھی نا بلد ہوتے ہیں مگر ان کا اصل المیہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلامی تاریخ و تہذیب کو اپنی متعصبا نہ عینک اور اپنی دینی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس میں ان کے تہذیب شعور و زاویہ نگاہ کا بھی خاصا دخل ہوتا ہے لہذا اگر وہ اسلامی تہذیب و تاریخ کو دانستہ مسخ نہیں بھی کرتے تو بھی ان کی نگاہ اس کے سیاہ پہلو پر ہی نکلتی ہے، وہ تاریخ مسخ کرتے ہیں۔

ان کتابوں کی تدریس و تعلیم اور مطالعہ سے قارئین بالخصوص طلبہ کے سامنے اسلامی تاریخ

اور اسلامی تہذیب کا بڑا محدود اور مسخ شدہ تصور پیدا ہوتا ہے، مسلم تحریروں سے وہ واقعات اور ”اخبار“ سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن تاریخی شعور اور تہذیبی ادراک سے محروم رہتے ہیں۔ غیر مسلم نگارشات سے معلومات کے حصول کے باوجود زاویہ نگاہ کج ہوتا ہے اور اپنے تاریخ اور تہذیبی سرمایہ پر افتخار و اعتماد کے بجائے شرم و تشفر کا احساس پیدا ہوتا ہے جو احساس کمتری کو جنم دے کر میدان حیات میں بے عمل بناتا ہے۔

تاریخ و تہذیب اسلامی کے چالیس سالہ مطالعہ اور پچیس سالہ تدریس و تعلیم کے تجربات کے دوران یہ حقیقت برابر روشن ہوتی اور مضطرب کرتی رہی کہ طلباء اور قارئین کے ہاتھ میں کوئی کتاب پورے اعتماد کے ساتھ نہیں دی جاسکتی کہ کسی میں دین کا زیاں تھا تو کسی میں علم کا۔ مدتوں یہ احساس بھی بے چین کرتا رہا کہ اپنے فہم و شعور اور تجربات کی روشنی میں اسلامی تاریخ اور تہذیب پر ایک جامع درسی کتاب لکھی جائے تاکہ وقت کی ضرورت، علم کا تقاضا اور دین کا مطالبہ پورا ہو۔ کئی برس بیشتر ایسے درسی سلسلہ کی ایک کتاب لکھ بھی ڈالی مگر وہ خاصی ضخیم ہو گئی۔ متعدد بزرگوں، خیر خواہوں، دوستوں، رفیقوں اور شاگردوں نے مسلسل اصرار کیا کہ ایک مختصر جامع سلسلہ تاریخ اسلامی تیار کر کے جلد از جلد پیش کیا جائے۔

اس کتاب میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ اسلامی اور آفاقی نقطہ نظر سے تاریخ و تہذیب کا مطالعہ کیا جائے اور مختلف ادوار میں اس کا ارتقائی عمل بھی دکھایا جائے۔ مختلف ادوار میں تاریخ و تہذیب کو محض آسانی اور شناخت کی خاطر تقسیم کیا گیا ہے ورنہ تاریخی عمل اور تہذیبی ارتقاء کسی حد بندی کو قبول نہیں کرتا۔ اس کا تسلسل جاری رہتا ہے خواہ نظر آئے یا نہ آئے۔ اسلامی اور آفاقی نقطہ نظر کی تشریح میں جلدی سے یہ عرض کر دوں کہ اس سے مراد وہ حدیث نبوی ہے جس کا مفہوم ہے کہ حکمت مرد مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے وہ جہاں بھی ملے مرد مومن ہی اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔

ان کتابوں کی تالیف میں سکول و کالج اور یونیورسٹیز کے طلباء کے علاوہ عام قارئین اور عام مسلم اور غیر مسلم قارئین کی درسی اور علمی ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ ان سب کو صحیح معلومات اور صحیح زاویہ نگاہ سے آگاہ کیا جائے۔ اس کوشش میں کہاں تک کامیابی یا ناکامی ہوئی ہے اس سے قارئین کرام، طلباء عزیز، اساتذہ

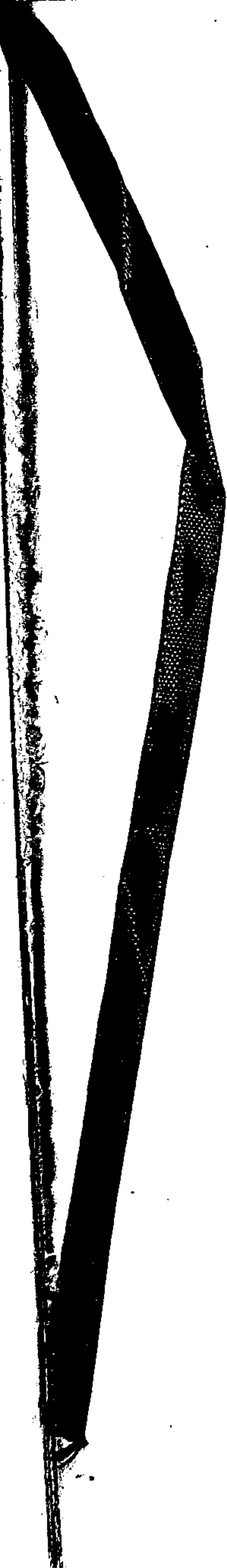
عظام اور ماہرین تاریخ زیادہ واقف ہوں گے۔ ان سب سے التماس ہے کہ معلومات کی غلطیوں اور تعبیر کی خامیوں سے راقم کو آگاہ کریں تاکہ ان کی اصلاح اپنے قلب و نظر میں بھی کر لوں اور آئندہ طباعتوں کے اوراق و صفحات گم کردہ راہ میں بھی۔

یہ میرا فرض ہے اور سعادت بھی کہ اس سلسلہ درس کی تیاری میں تمام معاون افراد اور اداروں کا شکریہ ادا کروں۔ میرے مرحوم والدین..... الحاج انعام علی صدیقی اور بی بی تسلیم صاحبہ..... کا احسان مرنے کے بعد بھی قائم و دائم رہے گا کہ انھوں نے اپنے خون جگر میں بیکراں الفت و محبت کی شیر و شکر ملا کر اس حقیر مؤلف کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ ان کا احسان نہ ہوتا تو کندہ ناتراش رہ جاتا۔ موجودہ کاوش بھی انھیں کے حسنات میں ہی شمار کرنی چاہیے اور میں اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ اس کو ان کیلئے توشہ مغفرت بنائے۔

احباب و رفقاءے کار اور دوسرے محسنوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ سب کا عمومی شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن برادر مکرم محمد اعظم قاسمی اور برادر عزیز ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر منظور عالم چیئر مین آئی، او، ایس کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے مخلصانہ تبصروں اور محبت آگئیں مشوروں سے اس سلسلہ درس کو مفید تر بنانے میں بہت مدد ملی۔ میں اپنی رفیق حیات شمس النساء یاسمین اور اپنے سعادت مند بچوں..... زینت، رخسانہ احمد مبین، احمد معین، احمد امین اور خالد اسمعیل..... کے احسان کا اعتراف کروں جو وہ اپنی بیکراں خدمت، بے پناہ محبت اور بے غرض عقیدت کی صورت میں مجھ پر مسلسل کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو دونوں جہانوں کی سعادتوں سے نوازا۔

اور سب سے آخر میں اور سب سے اول بھی میں اپنے مہربان منعم حقیقی..... اللہ تعالیٰ..... کی جناب میں سجدہ شکر بجالاتا ہوں کہ اسی نے حیات مستعار کی نعمتوں سے نوازا اور اسی سے امید بھی ہے اور دعا بھی کہ وہ آخرت کی سعادتوں سے بھی نوازے۔

محمد یسین مظہر صدیقی



مقدمہ

تاریخ تہذیب اسلامی

یہ کتاب اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب سے بحث کرتی ہے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام، تاریخ، اسلامی تہذیب و تمدن کے تصورات کو خوب سمجھ لیا جائے۔ کیوں کہ بہت سے ذہنوں میں یا تو یہ تصورات واضح نہیں ہیں یا ان کے بارے میں لاعلمی اور اسلام مخالف تحریروں کی بنا پر کئی شبہات اور الجھنیں ہیں۔

اسلام:

(اسلام کے معنی ہیں اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکا دینا اور پوری طرح اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دینا) اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی اس کے احکام پر چلنے سے حاصل ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان اور ساری کائنات کو پیدا کیا اور ان کی مادی ضرورتیں پوری کیں۔ اسی طرح اس نے انسانوں کی روحانی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے ہر زمانے اور ہر قوم میں اپنے رسول بھی بھیجے۔ بعض رسولوں کے ساتھ اس نے کتابیں بھی نازل کی ہیں۔ اللہ کے رسول اور اس کی کتابیں لوگوں کو اللہ کی مرضی اور اس کے احکام بتاتے رہے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ اسلام کی تاریخ دنیا میں اللہ کے پہلے رسول کی آمد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ پہلے رسول حضرت آدم علیہ السلام تھے جو پہلے انسان بھی تھے۔ انہیں سے پوری انسانی نسل چلی جو آدمی کہلائی۔ جب جب اللہ تعالیٰ کے احکام بھلا دیئے گئے اور انسان گمراہی میں پڑے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و کرم سے ان کی ہدایت کیلئے رسول بھیجے۔ ایک روایت کے مطابق ان

رسولوں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔

✓ ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ آپ اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید لائے۔ اس میں بہت سے رسولوں کا ذکر ہے۔ ان میں حضرت نوح، حضرت ادریس، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت اسمعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت شعیب، حضرت لوط، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام بہت اہم اور یہ سب اسلام کے رسول تھے اور اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی قوم کے لئے اسلام کا پیغام لائے تھے۔ قرآن مجید میں ان کے دین کو اسلام اور ان کو مسلم کہا گیا ہے۔ قرآن مجید ہی میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی دین ہے اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا وہ اللہ کو قبول نہ ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کے پاس سے جتنے رسول آئے وہ سب اسلام ہی کے رسول تھے۔ پھر عقلی اور منطقی طور سے بھی یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ جب اللہ واحد (اکیلا) ہے تو اس کے بھیجے ہوئے تمام رسول ایک ہی پیغام اور ایک ہی دین لے کر آئے اور وہ دین اسلام ہے۔

آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے تمام رسول ایک خاص زمانے اور ایک خاص قوم کی ہدایت کے لئے آئے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک وقت میں دو رسول ایک ہی جگہ ہوئے یا دو مختلف مقامات پر، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں مصر میں فرعون اور بنو اسرائیل کی ہدایت کیلئے بھیجے گئے تھے۔ یا حضرات ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام دو الگ الگ قوموں کے لیے حضرت موسیٰ کے ایک اور معاصر رسول حضرت شعیب علیہ السلام تھے جو اپنی قوم کے رسول تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ جو اسلام لائے تھے وہ ان کی قوم کیلئے تو کافی تھا مگر اپنی جگہ مکمل نہ تھا۔ وہ ان کے زمانے اور ان کی قوم کیلئے تھا مگر ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے نہ تھا۔

دراصل معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق میں اور اس کی ہر چیز میں تدریجی ارتقا (درجہ بدرجہ ترقی) کا اصول رکھا ہے اور وہ رسالت کے ادارہ میں بھی جاری و ساری ہے۔ انسانی فہم و شعور آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہا ہے وہ رسالت کے ادارے بلکہ پورے دین دھیرے

دعیرے ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے رفتہ رفتہ ہر زمانے میں انسانی ذہن کو اس کے معیار کے مطابق تیار کیا جاتا رہا اور جب وہ اس منزل پر پہنچ گیا کہ دین کو پوری طرح سمجھ سکے تو اسلام کو مکمل کر دیا گیا اور اللہ کے آخری رسول کو اس کی آخری کتاب لے کر اس دین میں بھیجا گیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو اپنی حدیث میں یوں سمجھایا ہے کہ تمام رسول دین کی عمارت تعمیر کرتے رہے۔ اس میں ایک اینٹ کی جگہ بچ رہی تھی۔ آپؐ نے وہ آخری اینٹ لگا کر عمارت پوری کر دی۔ قرآن مجید نے اس کو یوں واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق میں نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا کہ اب اس کے بعد کوئی اور دین قابل قبول نہیں۔ جب دین کی تکمیل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ کر لیا تو ہمارے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین (آخری رسول) قرار دیے گئے کہ آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی رسول اور نبی نہ آئے گا۔ لہذا آپؐ آپؐ کا لایا ہوا دین اسلام مکمل ہونے کے ساتھ آفاقی اور ابدی یعنی ہر زمانے کے لیے اور تمام انسانوں کیلئے ہے۔

دین اسلام کے کئی پہلو ہیں: ایک کا تعلق عقیدہ سے ہے اور بنیادی عقیدہ توحید ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک الہ و معبود ماننا اور اس کے سوا کسی کہ الہ و معبود تسلیم نہ کرنا۔ اسی کے ساتھ دوا اور اہم ترین عقیدت جڑے ہوئے ہیں: اس کے تمام رسولوں پر ایمان رکھنا اور آخرت کو ماننا۔ یہ تین بنیادی عقائد اسلام ہیں اور ان کے ضمنی عقیدے بھی ہیں جیسے فرشتوں، کتابوں، تقدیر اور جنت و جہنم وغیرہ پر ایمان رکھنا۔

دوسرا پہلو عبادت ہے اور اس میں بنیادی طور سے چار ارکان اسلام شامل ہیں یعنی صلوٰۃ (نماز) صوم (روزہ رمضان) زکوٰۃ اور حج۔

تیسرا پہلو معاملات سے متعلق ہے یعنی مسلمانوں کا مسلمانوں اور دوسرے انسانوں سے کیسا تعلق ہو اور اسی کے ساتھ اخلاق بھی شامل ہے۔ انسانی تعلقات کا باب بہت وسیع ہے۔ اس میں سیاست، معاشرت، معاش و اقتصاد غرضیکہ مسلم کا ہر قول و فعل آجاتا ہے۔ اسلامی قانون شریعت اسی کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسی کی تکمیل دین اسلام کی تکمیل کہلائی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ

ناقابل تبدیلی ہے اور قیامت تک کیلئے قائم اور جاری رہنے کیلئے آیا ہے۔ (۲)

تاریخ:

تاریخ کی تعریف وقت اور مقام کے لحاظ سے بدلتی رہی۔ اس لیے اس پر مورخوں کا اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن یہ اختلافات دراصل تدریجی ارتقاء کے اصول کے تحت تاریخ کے نظریہ کا ارتقاء ہے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا اور آج بھی بعض لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ واقعات کو بیان کرنے کا نام تاریخ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر واقعہ تاریخ نہیں بناتا۔ صرف وہ واقعات تاریخ بناتے یا تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں جو اہم ہوتے ہیں اور انسانی زندگی کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتے ہیں۔ خواہ وہ منفی طور سے اسے خراب کریں خواہ مثبت طور سے اس کو بنائیں اور سنواریں۔ اب تک ایسے اہم واقعات کو تاریخ سمجھا اور بیان کیا جاتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تاریخ کے واقعات تو ہیں مگر تاریخ نہیں۔ مدت تک مسلمانوں نے بھی واقعات کی کھتونی کو تاریخ سمجھا اور اب بھی اکثر مشرقی لوگ یا غیر تاریخ داں یہی سمجھتے ہیں۔

درحقیقت تاریخ نام ہے زمانہ اور ماحول کے حوالہ سے انسان کے مطالعہ کا۔ ایک خاص زمانہ میں انسانوں کے ایک خاص گروہ یا گروہوں نے اپنے ماحول میں کارنامے یا سیاہ کروت انجام دیئے اور انہوں نے انسانی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھایا یا پیچھے ڈھکیلا۔ انسانی زندگی کے اس آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کو تاریخ کہا جاتا ہے۔ محض تاریخی واقعات کو بیان کر دینا تاریخ نہیں ہے بلکہ ان تاریخی واقعات کی بنیاد پر اس زمانہ اور ماحول کے انسانی معاشرہ کی بازیافت کرنا یا اس کی صحیح تصویر کشی کرنا تاریخ ہے۔

انسانی سماج کی یہ تصویر کشی یا بازیافت اس طرح ہوتی ہے کہ مورخ یا تاریخ داں تاریخی واقعات کو بیان کرتے وقت ان کے اسباب کا پتہ لگائے جو تاریخ بناتے ہیں اور ان کے اثرات کا تجزیہ کرے جو پوری انسانی زندگی پر یا اس کے ایک سماج و معاشرہ پر اثر انداز ہو کر اس کو ایک خاص سمت میں لگا دیتے ہیں۔ لہذا مورخ کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعات جمع کرے، پھر ان کو سچ یا جھوٹ کے ترازوں میں تولے، جھوٹے واقعات کو چھوڑ دے اور صرف سچے

واقعات کو لے لے۔ ان سچے واقعات کے اسباب کا پتہ لگائے کہ وہ کیوں اور کیسے پیش آئے اور ان اسباب کا پتہ لگاتے وقت اس کے ذہن میں یہ بات واضح رہے کہ وہ سچائی اور صرف سچائی کی تلاش میں نکلا ہے اور ان کو سچائی، ایمان داری اور عملی معروضیت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ پھر ان واقعات کی بنا پر وہ اس سماج اور معاشرہ کی تصویر پیش کرے۔

معروضیت کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ واقعات کے تجزیہ کے بعد جو تصویر ابھرتی اور جو انسانی زندگی نظر آتی ہے اسے پیش کرے۔ نہ کہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبہ یا اپنے خیال و عقیدہ کے مطابق واقعات تلاش کرے۔ اپنی پسند کی تصویر بنائے۔ تاریخی واقعات کے تجزیہ میں سب سے مشکل مقام یہیں آتا ہے کہ واقعات کی بتائی ہوئی تصویر پیش کرے یا اپنے عقیدہ، مذہب، تصور، خیال یا منصوبہ کے مطابق اس کو بنائے۔ ظاہر ہے کہ اصل تاریخ پیش کرنے میں وہ سچا ہوگا اور اپنی پسند و ناپسند کے مطابق پیش کرنے میں وہ جھوٹا ہوگا۔

اسلامی تاریخ:

اسلامی نظریہ تاریخ اور غیر اسلامی تصور تاریخ میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ غیر مسلم مؤرخین تاریخی واقعات کو غیر جانبدار مانتے ہیں کہ وہ نہ اس طرف جبکہ مسلم مورخین کے نزدیک تمام تاریخی واقعات حق اور سچائی کے طرفدار ہوتے ہیں یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں حق و سچائی پر گواہی چھپی ہوتی ہے۔

دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ غیر اسلامی تاریخ داں صرف تاریخی واقعات ہی کو تاریخ بنانے یا بگاڑنے والا مانتے ہیں جب کہ اسلامی تاریخ نگاری کا ایک اصول یہ ہے کہ بلا شک اسباب و علل تاریخی واقعات بناتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا چھپا ہوا ہاتھ اور ارادہ بھی ہمیشہ کا رفرما رہتا ہے اور وہ بہت سے اسباب و عوامل کی نفی کر دیتا ہے۔ قرآن مجید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی آیات و احادیث میں اس ہمیشہ جاری و ساری رہنے والے چھپے ہوئے ارادہ الہی کا ذکر ملتا ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ بہت سے ظاہری اسباب کا نتیجہ الٹا ہوتا ہے۔ یا بہت سے واقعات کے اسباب کا پتہ نہیں چلتا۔ ظاہر ہے کہ انسانی ہاتھ کے بنائے ہوئے تاریخی واقعات

کے علاوہ کچھ بلکہ بہت سے ”قدرتی اسباب ہوتے ہیں اور ان قدرتی اسباب میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا ارادہ کام کر رہا ہوتا ہے۔

مشہور مسلم مورخ ابن خلدون (۸۰۸.....۵۷۳۲ھ/۱۴۰۶.....۱۳۳۲) نے اپنا جو فلسفہ تاریخ پیش کیا ہے اس میں یہی قرآنی اسلامی فلسفہ تاریخ نمایاں ہے۔ اس کے نزدیک ٹھوس واقعات تاریخ کا ”ظاہر“ ہیں۔ ان کے پیچھے تاریخ کا ”باطن“ چھپا ہوا ہے۔ ظاہری واقعات باطنی واقعات سے مل کر تاریخ بناتے ہیں اور ان دونوں کا جب تک ملا کر مطالعہ نہ کیا جائے صحیح تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ باطنی واقعات دراصل تاریخ کے اصولوں پر مبنی ہیں اور یہ اصول اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اور اس کی مشیت کے تابع ہیں۔

اسلامی تاریخ کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ اس کا مطالعہ کس مقصد سے کیا جائے قرآن مجید اور دوسرے اسلامی مآخذ بتاتے ہیں کہ تاریخ کا مطالعہ عبرت و نصیحت کے لیے کرنا چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخی واقعات سے انسان کو سبق لے کر اپنی پوری زندگی سنواری چاہئے۔ معاشرہ اور سماج کیلئے بھی یہی لازم ہے کہ وہ اللہ کی باغی قوموں کے طرز حیات اور طریقہ کو اپنائے تاکہ اس کو دونوں جہانوں میں بھلائی اور کامیابی عطا ہو۔ وہ صرف دنیا میں کامیاب ہونے کی تمنا نہ کرے بلکہ قرآنی دعا کے مطابق دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی اور نیکی کی آرزو کرے اور اسی کے لئے کوشش کرے۔

اسلامی تاریخ کے کچھ بنیادی تصورات اور نظریات ہیں جو غیر اسلامی تاریخ میں بالعموم نہیں پائے جاتے۔

اول یہ کہ اسلامی تاریخ کا تصور عقیدہ اور دین سے جڑا ہوا ہے بلکہ ابتدائی دور کی تاریخ سراسر دین کی تاریخ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اپنے دین اسلام کو جاننے اور سمجھنے کیلئے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنا لازمی ہے۔ اسی طرح وہ اسلامی تہذیب و تمدن کی پہچان اور شناخت کے لئے لازمی ہے۔

غیر اسلامی تاریخ دوسرے معاملہ میں شرکت رکھتی ہے کہ تاریخ ہر قوم و ملت کا آئینہ اور رابطہ ہے، جب تک کوئی قوم اپنی تاریخ سے واقف نہ ہو۔ اس کا رشتہ نہ صرف اس کے ماضی سے

کٹ جاتا ہے بلکہ وہ زمانے کے اندھیروں میں یوں کھو جاتی ہے کہ نہ تو اسے اپنے آغاز کی خبر رہتی ہے، نہ حال کو ماضی سے روشنی ملتی ہے اور نہ مستقبل اس کی رہنمائی کے بغیر سنور سکتا ہے۔ مسلمانوں کا معاملہ اس سے بڑھ کر ہے۔ اسلامی تاریخ کے علم کے بغیر وہ نہ صرف تہذیبی خلا اور تاریخی جہالت میں جھولتے رہ جاتے ہیں بلکہ اپنے مذہب سے بے گانہ، اپنی شناخت سے ناواقف، اپنے دین سے بے خبر اور اپنے اسلام سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے شاندار ورثہ سے محروم ہوتے ہیں تو دوسری طرف غیر اسلامی اثرات ان پر اس شد و مد سے چھا جاتے ہیں کہ دوسری تہذیبوں سے مرغوب اور دوسرے مذہبوں سے خائف ہو جاتے ہیں، ناواقفیت اور دوسرے اثرات کے تحت وہ اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب سے شرمندہ بھی رہتے ہیں اور پھر ان کی پوری زندگی خجالت و شرمساری اور دوسروں کی کاسہ لیس یا نقالی میں گذرتی ہے۔ ان کا مذہب اور دین صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس سے زندگی میں صرف منفی رویہ پیدا ہوتا ہے اور اقدام و حرکت ختم ہو جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ اسلامی تاریخ پوری تہذیب اسلامی کا احاطہ کرتی ہے اس لیے وہ مختلف علوم و فنون کی جامع رابطہ کی کڑی ہے۔ اپنا مطالعہ کرنے والے کو ان تمام علوم و فنون اور ان کے ارتقاء سے واقف کراتی ہے جو مسلمانوں کا دین ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ مختلف علوم و فنون کے درمیان ربط کا کام دیتی ہے۔ قرآن قرآنی علوم، حدیث، فقہ، کلام، فلسفہ، سائنس، طب غرضیکہ تمام فنون کی تاریخ بیان کر کے ان کے درمیان پائے جانے والے ربط کو اجاگر کرتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ سماجی ارتقاء معاشی اداروں اور تہذیبی اقدار بھی واضح کرتی ہے۔

تیسرے یہ کہ مسلم و مومن کو قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ اسے بتاتی رہتی ہے کہ کن کن چیزوں سے بچنا چاہئے اور کن کن چیزوں پر عمل کرنا چاہئے تاکہ دنیا کی ترقی اور آخرت کی بھلائی دونوں مل سکیں۔ اب یہ حقیقت تاریخی واقعات کی روشنی میں تسلیم کی جاتی ہے کہ مسلم دنیا نے جب بھی مادی اور روحانی ترقی کی تو ان کے ہاتھ میں اسلام کا چراغ ہدایت تھا۔ جب تک وہ صحیح اسلامی تعلیمات..... قرآن و حدیث..... کو مضبوطی سے تھامے رہے، انہوں نے دنیا میں ہر طرح کی ترقی کی۔ یہاں تک کہ ان کے برابر کوئی قوم نہ رہی اور جب سے انہوں

نے اسلام کی تعلیمات کو نظر انداز کیا، وہ زوال کے اندھیروں اور ذلت کی رسوائیوں میں برابر گرتے جا رہے ہیں۔

چوتھے یہ کہ تاریخ اسلامی کو اسلام کی استقامت اور ترقی کیلئے کام کرنا چاہیے۔ اس کے ذریعہ اسلام کا دفاع کرنا چاہئے کہ یہی تقاضا وہ مسلمانوں سے کرتی ہے۔

پانچویں اسلامی تاریخ آفاقی اور بین الاقوامی رجحانات رکھتی ہے۔ وہ مختلف لسانی جغرافیائی، گروہی، مسلکی طبقات و اقوام میں اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرتی اور پوری نوع انسانی کو ایک رشتہ وحدت میں پروتی ہے جب کہ دوسری تاریخ ان کو مختلف اکائیوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے بعض اور نظریات و تصورات بھی ہیں جن سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ آخر میں اس سوال کا جواب کہ ہم اسلامی تاریخ کا مطالعہ کس عہد سے کریں ہماری تعریف کے مطابق تو اس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہونا چاہئے مگر صحیح تاریخی واقعات اور مصادر کی کمی کی وجہ سے ہم آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔ اس میں ابتدائی اسلامی تاریخ کے بنیادی نکات بھی آجاتے ہیں۔ چوں کہ تمام اسلامی ادوار میں تاریخ، اسلام کے محور پر گھومتی ہے، اس لیے وہ اسلامی تاریخ کہلاتی ہے۔ بغیر اسلام کے نہ تو انسان مسلمان ہے اور نہ تاریخ اسلامی ہے۔

تہذیب و تمدن:

تہذیب و تمدن یا ثقافت کی تعریفوں اور ان میں اختلافات سے الجھے بغیر سیدھے سادے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب کوئی انسانی گروہ یا معاشرہ و سماج مذہبی معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، علمی، عقلی اور اخلاقی میدانوں میں ترقی کا ایک خاص درجہ حاصل کر لیتا ہے تو اسی کو اس کی تہذیب یا ثقافت کہتے ہیں۔ دراصل سماجی معاشرت اور مجموعی طرز زندگی کو تہذیب و تمدن کہنا چاہئے۔ اس موضوع کے مطالعہ کے دو اہم پہلو ہیں: اول کسی قوم یا سماج کا نصب العین یا آدرش جیسے انگریزی میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں اور دوم مقامی رسوم و رواج اور روایات۔

اسلامی معاشرہ کا آدرش ظاہر ہے کہ اسلام ہے۔ اسلام کا مذہبی آدرش اللہ تعالیٰ کا اس

کے بندوں سے براہ راست تعلق جوڑنا ہے اور یہ تعلق سچے دل سے کلمہ طیبہ کے اقرار اور اس پر خلوص کے ساتھ عمل سے ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار و یقین کرنا اور حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو اس کا آخری رسول و پیغمبر ماننا اور سمجھنا۔ ان دونوں کا عملی مظاہرہ اسلام کے ارکان اور دوسرے تمام احکام اور تعلیمات پر عمل کرنا ہے۔ معاشرتی یا سماجی لحاظ سے اسلام ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد مسلمانوں کی اخوت اور احترام پر قائم ہو جس میں اجتماعی عدل و انصاف ہو اور فرد اور ہر گروہ کے بنیادی اور قانونی حقوق کا احترام کیا جائے۔ جہاں ذات برادری، رنگ و نسل، علاقہ و محلہ اور دوسری تعصب والی تقسیموں کی بنیاد پر کسی کے خلاف امتیاز و سلوک نہ برتنا جائے۔

(اقتصادی لحاظ سے اسلام دولت کی منصفانہ تقسیم چاہتا ہے۔ وہ امیر و غریب کے فرق کو کم سے کم کرنا چاہتا ہے۔ ان کے تمام طبقات کو ختم کر کے مکمل معاشی مساوات کا تصور قانون اسلام کے خلاف ہے۔ کیوں کہ قرآن صاف کہتا ہے کہ اللہ انسانوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کرتا ہے۔ البتہ وہ امیروں اور مالداروں کے مال میں غریبوں کا حق مقرر کرتا ہے۔)

(سیاسی اعتبار سے اسلام ایک حقیقی فلاحی ریاست قائم کرنا چاہتا ہے جہاں ہر فرد ہر طبقہ اور ہر گروہ کے حقوق کا خیال رکھا جائے اور سب کو قانون کی نظر میں برابر سمجھا جائے۔ اسلام کی نظر میں کوئی شخص بھی حاکم اعلیٰ سے لے کر معمولی مزدور تک قانون سے بالاتر نہیں ہے۔)

علمی اسلامی آدرش رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث شریف میں یوں بیان ہوا ہے کہ حکمت و دانائی کی بات مسلمان کی میراث ہے، اسے جہاں پائے وہ اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ دوسری حدیث میں بتایا گیا کہ علم حاصل کرنا ہر مومن کا فرض ہے۔ اس لیے علمی اور فنی ترقی اسلام کا لازمی تقاضا اور مطالبہ ہے۔ اسلام عقل کے استعمال کے خلاف نہیں بلکہ غور و فکر اور تدبر کو تو قرآن مجید کی آیات تک کے بارے میں ضروری قرار دیا ہے، مگر وہ عقل کو وحی الہی یعنی قرآن و حدیث کے ماتحت اور اس کے دائرہ کار میں استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ تنہا عقل گمراہی نہ پھیلے۔ وہ اخلاقی لحاظ سے مسلمانوں کو اس بلند ترین مقام پر پہنچانا چاہتا ہے جہاں ہر کام کی بنیاد تقویٰ (اللہ کے خیال، اس کی محبت اور اس کے خوف) پر ہو۔ نہ صرف

مسلمان بلکہ تمام شہری اچھے اخلاق والے ہوں۔ اسلامی آدرشوں نے اصول و فروغ وضع کر دیئے ہیں۔ انھیں کی روشنی میں اسلامی سماج کے تمام رسوم و رواج اور روایات کو گردش کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ کھانے پینے پہننے اوڑھنے، لیٹنے بیٹھنے، شادی بیاہ، میلے ٹھیلے، تیوہار و تقریب، جلسہ و جلوس وغیرہ کے مقامی رسوم و رواج ہوتے ہیں۔ اسلام ان تمام رسوم و رواج اور روایات کو ختم نہیں کرتا بلکہ ان کی اصلاح کر کے ان کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال لیتا ہے، اگر ان اسلامی اصولوں کے خلاف کوئی چیز نہیں تو ان کو اسی طرح قبول کر لیتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے جاہلی رسوم و رواج کو یکسر غارت نہیں کیا تھا بلکہ ان کی اچھی چیزوں کی توح قبول کر لی تھیں اور برے پہلوؤں کی اصلاح کر دی تھی۔

انھیں دونوں پہلوؤں کے مجموعہ سے زندگی کا جو چلن ابھرتا ہے وہ اسلامی تہذیب ہے۔

جاہلی عرب

اسلام کی تکمیل اور اس کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کی کارگزاریوں کا علاقہ عرب نام کا ملک ہے۔ اسی بنا پر اسے اسلام کا گہوارہ اور وطن بھی کہا جاتا ہے، وہاں اسلام کا قبلہ و کعبہ اور بہت سے دوسرے اہم آثار و مراکز ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس ملک کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لیں۔

عرب کی وجہ تسمیہ:

عرب نام کے بارے میں دو رائیں ہیں: ایک یہ کہ عرب کے معنی صحرا اور ریگستان کے ہیں۔ اس لیے اس ملک کا یہ نام پڑا اور یہاں کے باشندوں نے بھی اپنا یہی نام قرار دیا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ عرب کے معنی ہیں۔ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ بولنے والے، چوں کہ یہاں کے رہنے والے زبان کو سب سے زیادہ فصیح و بلیغ سمجھتے تھے اور خود کو سب سے عمدہ زبان بولنے والا، اس لیے ان کا ملک اور وہ خود بھی عرب کہلائے۔ باقی لوگوں کو انہوں نے عجم کہا یعنی بے زبان و گونگے۔ دوسری رائے زیادہ صحیح نہیں ہے بلکہ پہلی رائے ہی صحیح ہے۔

عربی زبان و لغت کے اعتبار سے اور بعض دوسرے دلائل کے سبب بھی عرب لفظ سے جتنے دوسرے الفاظ بنتے ہیں ان میں صحرا یا ریگستان کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے۔ دوسرے عجم کے صحیح معنی نامعلوم یا غریب و اجنبی کے ہیں۔ چوں کہ عرب دوسرے ملکوں کو نہیں جانتے تھے اس لیے ان کا یہ

نام رکھا۔ پھر عربی زبان کی موجودہ شکل نسبتاً نئی ہے اور کافی بعد میں ترقی کے اس درجہ پر پہنچی ہے۔ اسلام سے چند صدیوں قبل ان کی زبان اتنی ترقی یافتہ نہ تھی عرب اس وقت بھی تھے۔

عرب کا جغرافیہ:

جغرافیائی حالات کا انسان، انسانی تاریخ و تہذیب اور اس کے ارتقاء کے عمل پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اس لیے عرب کا مختصر جغرافیہ جاننا ضروری ہے۔

دنیا کے نقشہ پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب براعظم ایشیا کے جنوبی مغربی کنارے پر واقع ہے اس کو مغرب میں بحر احمر (RED SEA) افریقہ کے براعظم سے علیحدہ کرتا ہے افریقہ کے ایک ملک حبشہ (ABYSSINIA) سے عربوں کے پرانے تعلقات تھے جو اولین مسلمانوں کے بھی بہت کام آئے۔ حبشہ سے جانب شمال بحر احمر کے شمالی سرے پر خلیج عقبہ کے سامنے افریقہ کا ایک اہم ترین ملک مصر (EGYPT) ہے۔ ایشیا میں ملک عرب کے مغرب میں صرف بحر احمر ہے۔

عرب کے شمال میں ملک شام ہے جو اس وقت بازنطینی سلطنت (EMPIRE-BYZANTINE) کا ایک حصہ تھا۔ شمال کے شمال میں ترکی کا علاقہ ہے جو اس زمانے میں بازنطینی سلطنت کا مرکز ہے۔

شام کے مشرق اور عرب کے شمال مشرق میں عراق کا ملک ہے جو اس زمانے کی سب سے بڑی سلطنت ایران کی ساسانی سلطنت (SASSANID EMPIRE) کے ماتحت تھا۔ عرب کے مشرق میں عراق سے ملا ہوا ایران ہے۔ اس کے شمال میں ترکستان یا وسطی ایشیا (CENTRAL ASIA) کا علاقہ ہے جس کی سرحدیں چین کی سلطنت سے جا ملتی ہیں۔

ایران کے جنوب مشرقی خلیج فارس (PERSIAN GULF) ہے اور عرب کے اس مشرقی حصہ میں ایران سے ملا ہوا علاقہ بحرین ہے اور اس سے جانب جنوب میں بالترتیب عمان اور ہجر کی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں تھیں۔ عرب کے بالکل جنوب میں بحر ہند (INDIAN OCEAN) ہے۔ اور عرب کی چھوٹی پٹی میں ہجر سے ملا ہوا حضرموت کا وسیع علاقہ ہے۔

اور بالکل جنوب مغرب میں بحر احمر کے کنارے کے قریب مشہور ملک یمن ہے۔
بحر احمر کے سمندری راستے سے جنوب میں بحر ہند میں ہو کر لوگ سیدھے جنوب میں چلتے
تو ہندوستان کے مغربی ساحل اور لنکا وغیرہ تک جانے اور جنوب میں مشرق کی طرف مڑتے تو
خلیج فارس میں واقع جزیروں اور ایران کے مغربی ساحل پر پہنچتے۔

بحر احمر میں سیدھے شمال میں چلتے تو مشرق میں عرب کا مغرب ساحل اور اس کے بندرگاہ
پڑتے تھے۔ یہ پورا علاقہ حجاز کہلاتا ہے۔ مغرب میں افریقہ کا مشرقی ساحل اور اس کے سمندری
شہر آتے تھے اور آخر میں مصر پہنچ جاتے اور وہاں سے یورپ کو جاتے تھے۔ عرب کا ملک چوں
کہ تین طرف سے سمندر یا پانی سے گھرا ہوا ہے۔ اس لیے عرب اپنے ملک کو جزيرة العرب کہتے
ہیں گو کہ یہ جزیرہ نمائے عرب (Arbian Pormisula) ہے۔

عرب کی جغرافیائی تقسیم:

ملک عرب کی زمین کو جغرافیائی یا طبعی ساخت کے اعتبار سے کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا
ہے مگر مطالعہ کی آسانی کی خاطر ہم اس کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ ریگستان یا صحرا (DESERT) عرب کا بیشتر علاقہ ریگستان ہے۔ اس کے دو
بڑے حصے ہیں۔ ایک ”ربع الخالی“ کے نام سے جانا جاتا ہے، جو ملک کے جنوبی وسطی حصے میں
ہے۔ اور وہ جنوبی پٹی جس میں ہجر، حضرموت اور یمن وغیرہ ہے کو عرب کے مرکزی وسطی علاقے
نجد سے الگ کرتا ہے۔

دوسرا نجد کے علاقے میں شمال کی طرف ”النفوذ“ نامی ریگستان ہے۔ ان دونوں
ریگستانوں کو ایک سرخ ریشیلی مٹی الگ کرتی ہے جو الدھنا کہلاتی ہے۔ ان کے علاوہ بیچ بیچ میں
جارجار قبیلے علاقے اور پٹیاں بھری ہوئی ہیں۔ اس طرح بیشتر علاقہ ریگستانی ہے۔

موسم کے اعتبار سے ان کے دو حصے ہیں۔ ایک گرمائی علاقہ (SUMMER
ZONE) اور دوسرا سرمائی علاقہ (WINTER ZONE)۔ گرمائی علاقہ میں پانی اور سبزہ
موسم گرمائی ہی ہوتا ہے اور سرمائی علاقہ میں پانی اور سبزہ صرف سردی کے موسم میں ہوتا ہے۔

گرمی میں خالی ہوتا ہے۔

انسانی زندگی پر اس کا اثر یہ پڑا کہ صحرائی یا بدوی جنہیں عام طور سے بدو (BED-OUIN) کہا جاتا ہے۔ اپنی زندگی پانی اور سبزہ کے حصول کے لئے سال کے دونوں موسموں میں الگ الگ ان دونوں علاقوں میں گزارنے پر مجبور ہوتے تھے۔

۲۔ پہاڑی علاقہ: (HILLY REGIONS)

پورے عرب میں چھوٹے اور متوسط درجہ کے پہاڑی سلسلے بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور پہاڑ اور پہاڑی سلسلے یہ ہیں: سب سے لمبا سلسلہ جبل السراۃ ہے جو دکن میں یمن سے شروع ہو کر شام تک چلا گیا ہے۔ یمن کے پہاڑ اس کے نام سے معروف ہیں۔ مغربی ساحلی پٹی جو غور اور تمامہ کہلاتی ہے۔ جبال الحجاز کا حصہ ہے۔ مکہ مکرمہ کا شہر ایسے ہی ایک پہاڑی علاقہ میں واقع ہے۔

پہاڑوں پر زندگی ناممکن ہے البتہ پہاڑوں میں میدان پائے جاتے ہیں اور وہاں پانی اور سبزہ کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ان پہاڑی میدانوں میں زندگی گزارنا نسبتاً آسان ہے جیسے طائف کا شہر اور علاقہ ایسے ہی پہاڑی میدان میں واقع ہے۔ ان میں زمین زرخیز ہے اور ان میں سونے اور چاندی کی کانیں بھی پائی جاتی ہیں جن سے یہ دونوں معدن نکالی جاتی ہیں۔

۳۔ نخلستان: (OASIS)

ریگستان یا ریتیلے علاقوں کے بیچ میں جو سرسبز و شاداب علاقہ یا پٹی ہوتی ہے اسے نخلستان کہتے ہیں۔ یہاں پانی کی فراہمی کے سبب سبزہ اور چارہ موجود ہوتا ہے اور انسانی زندگی آسانی سے گزرتی ہے۔ عرب کے مشہور نخلستانوں میں مدینہ، خیبر، فذک، وادی القریٰ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں کاشت کاری اور کھجور کی باغبانی خوب ہوتی ہے۔

۴۔ میدانی علاقے: (PLAINS)

عرب میں بہت کم ہیں۔ ان میں سب سے اہم یمامہ کا علاقہ ہے جو عراق کے جنوب میں واقع ہے اور کافی زرخیز ہے۔ اس میں کافی اناج جیسے گہوں وغیرہ پیدا ہوتا ہے اور پورے عرب

۹۵۲۶۳

کو مہیا کیا جاتا ہے۔ مکہ کے قریش اسی کے غلہ پر بڑی حد تک انحصار کرتے تھے۔ نجد، یمن وغیرہ میں کافی میدان ہیں۔

عرب کے جغرافیائی حالات کا انسانی زندگی پر بہت گہرا اور مختلف اثر ہوا۔ عرب کے دونوں بڑے ریگستانوں میں اتنی سخت گرمی پڑتی ہے اور ”لو“ یا بادِ سموم کے ایسے شدید تھپڑے لگتے ہیں کہ وہاں جینا دشوار ہے۔ اس لیے وہاں آبادی بہت کم ہے۔ البتہ دوسرے ریگستانی علاقوں میں جہاں موسمِ اتنا سخت نہیں ہوتا انسانی آبادی پائی جاتی رہی ہے مگر پانی کی موسمی فراہمی کے سبب وہاں کی زندگی خانہ بدوش ہے۔ یعنی مستقل گردش میں رہتی ہے۔ موسمِ سرما کے علاقوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ اور گرمی کے موسم میں گرمائی علاقوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لوگ مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہی حال بعض میدانی علاقوں میں ہوتا ہے جہاں پانی نہیں ملتا۔ یہ آبادی بدو (اہل البادیۃ) کہلاتی ہے۔

پہاڑی میدانوں اور خاص کر نخلستانوں میں چوں کہ پانی اور کھانا نسبتاً آسانی سے ملتا ہے اس لیے وہاں مستقل آبادی ہوتی ہے جو ایک جگہ جم کر رہتی ہے۔ یہ لوگ شہری یا مہذب (اہل الحضارة) کہلاتے ہیں۔

اگرچہ عرب ہونے کے ناطے ان کی بنیادی خصوصیات یکساں ہیں۔ تاہم جغرافیائی اختلافات نے ان کے سماجی، اقتصادی و تہذیبی زندگی میں کافی فرق پیدا کر دیا ہے۔

عرب کے باشندے: (سامی قوم)

عرب قوم کے سامی اقوام (SEMETIC) یا بنو سام کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے۔ مورخین اور علمائے انساب (GENEALOGIST) کا اس معاملہ پر اختلافات ہے کہ یہ نسلی (RACIAL) تقسیم ہے یا لسانی (LINGUISTIC)

نسلی نظریہ:

قدیم علماء اور مورخین یہ مانتے آئے ہیں کہ عرب سام کی اولاد ہیں جو حضرت نوح علیہ

اسلام کے فرزند تھے۔ اس نسلی نظریہ کے مطابق انسانی آبادی حضرت نوح علیہ السلام کے تین فرزندوں سام، حام اور در یافت سے چلی۔

لسانی نظریہ:

جب کہ جدید علماء اور ماہرین کا خیال ہے کہ عرب لوگوں کو سامی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سامی زبان..... عربی..... بولتے ہیں۔ ماہرین لسانیات کے نظریہ کے مطابق سامی زبانوں کے خاندان میں عربی سب سے جدید اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس لسانی خاندان میں جو اہم ترین زبانیں شامل ہیں وہ یہ ہیں۔ ۱۔ اشوری، ۲۔ ہیلونی، ۳۔ عبرانی، ۴۔ آرامی، ۵۔ عربی اور ۶۔ حبشی۔

لسانی نظریہ کے دلائل:

لسانی بنیاد پر سامی قوم کی تشکیل و ترقی کا نظریہ انیسویں صدی میں پیدا ہوا۔ اس طرح کے کئی اسباب و بنیادیں ہیں: اول یہ کہ سامی زبانوں کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ سب آپس میں ملتی جلتی ہیں اور یکساں خصوصیات اور تشکیلی عناصر رکھتی ہیں۔

دوم یہ کہ جب ان زبانوں کے بولنے والوں کے تمام سماجی اداروں یعنی رسوم و روایات، مذہبی عقائد، اور جسمانی خدو خال کا گہرا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ آپس میں بہت مشابہ ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ لسانی مماثلت دراصل ان کی قدیم رشتہ داری کی وجہ سے ہے۔

ان کی یکسانیت کے اہم اوصاف یہ ہیں کہ ان تمام زبانوں کے بولنے والوں میں گہرا مذہبی جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان کا تصور و خیال بہت واضح ہوتا ہے ان سب میں نمایاں انفرادیت ہوتی ہے اور بہت واضح حساسیت ملتی ہے۔

اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہیلونی، اشوری، کلدانی، اموری، آرامی۔ فونیقی یہودی، عرب اور حبشی کسی زمانے میں ایک ہی خطہ میں رہتے ہوں گے اور اپک ہی قوم ہوں گے۔

سامی قوم کا اصلی وطن:

سامی نسلوں کے اصلی وطن کے بارے میں مؤرخین کے درمیان اختلافات رہا ہے جس

کے سبب ان کے تین اہم نظریات ہیں:

اون وہ لوگ ہیں جو سامی اور لوگوں کے درمیان وسیع لسانی رشتہ داری کی بنا پر خیال کرتے ہیں کہ ان کا اصلی وطن مشرقی افریقہ تھا۔

دوم وہ مؤرخین ہیں جو تورات و انجیل کی آیات سے متاثر ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ جزیرہ عراق (MESOPOTAMIA) ان کا اصلی وطن تھا۔

سوم سب سے مقبول و پسندیدہ نظریہ ہے کہ جزیرہ عرب سامی لوگوں کا اصل وطن تھا اور اس میں بھی سب سے پہلے جنوبی عرب کا ساحلی علاقہ۔

ان تینوں میں آخری نظریہ آج کل زیادہ مقبول اور صحیح سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ پہلے دو نظریات میں خاصا جھول ہے۔ جزیرہ عراق کو سامی وطن اصلی ماننے میں یہ قباحت ہے کہ اس میں پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دریاؤں کے کنارے کھیتی باڑی کرنے والے لوگوں نے اپنا علاقہ چھوڑ کر بدویانہ زندگی اور صحرا اختیار کر لیا۔ یہ تہذیبی ترقی کے اصول کے خلاف ہے کیوں کہ پہلے منظم زندگی بدوی تہذیب ہوتی ہے پھر وہ ترقی کر کے کاشتکاری پر مبنی تہذیب ملتی ہے۔ دوسرے نظریہ میں بھی بہت سے مسائل ہیں۔ اس بنا پر آخری نظریہ سب سے زیادہ صحیح سمجھا جاتا ہے۔

سامی لوگوں کا پھیلاؤ:

جزیرہ نمائے عرب میں رہنے اور سکونت کے لائق اس کے ساحلی مقامات یا پیٹاں ہیں۔ خاص کر جنوبی پٹی جو زیادہ چوڑی ہے۔ وہاں ایک خاص حد تک ہی آبادی رہ سکتی ہے جب آبادی ایک خاص حد سے آگے بڑھی اور اس کے وسائل آبادی کی ضروریات پوری نہ کر سکے تو فاضل آبادی نے دوسرے قابل رہائش علاقوں کا رخ کیا۔ ایک طرف سمندر سے اور دوسری طرف صحرا سے گھرے ہوئے ہونے کے سبب لوگ صرف مغربی پٹی کے ذریعہ ہی دوسرے علاقوں کو جاسکتے تھے اور بالآخر ایسا ہی ہوا۔ اس راستے پر وہ شمالی عرب کے قابل رہائش علاقوں سینا کی پٹی اور مصر کے دریائے نیل کی وادی وغیرہ تک مختلف اوقات میں پھیل گئے۔ سامی آبادی نے مختلف اوقات اور زمانوں میں شمالی کی جانب مختلف ہجرتیں کیں یا نقل وطن کیا:

(۱) ۳۵۰۰ ق م میں ان کا پہلا نقل وطن ہوا۔ وہ شمالی مغربی پٹی یا مشرقی افریقہ کے راستے مصر کی حامی قوم پر جا پڑے اور ان سے مل کر تاریخ کی وہ مصری قوم بنائی جو سامی اور حامی مخلوط قوم ہے۔ مصری تہذیب نے انسان کو کئی چیزیں دیں۔ ان میں پتھروں پر مبنی فن تعمیر اور شمسی تقویم ہے۔

(۲) اسی زمانے میں جنوبی عرب کے سامیوں نے ایک اور نقل مکانی کی۔ انہوں نے شمالی علاقوں کیلئے مشرقی راہ اختیار کی اور دریائے فرات و دریائے دجلہ کی وادی میں جا بے جہاں پہلے سے ایک زیادہ متمدن قوم سومیری آباد تھی۔ سامیوں نے سومیری قوم سے مستقل رہائش خاص کر مکانات بنا کر رہنے کا سلیقہ سیکھا اور اس سے زیادہ کھیتی باڑی اور لکھنے کے فن سیکھے۔ سومیری قوم سامی لوگ تھے۔ ان دونوں قوموں کی نسل سے ہیلونی قوم پیدا ہوئی جس نے مصریوں کے ساتھ مل کر انسانی تہذیب کی ایک اہم بنیاد رکھی۔ انہوں نے فن تعمیر میں محراب (ARCH) اور صندوق نما چھتوں (VAULF) کا گر سکھایا۔ اور ساتھ ہی پہیوں والی گاڑی اور تولنے کے بانٹ بنائے اور ناچنے کا طریقہ سکھایا۔

(۳) حضرت عیسیٰ کی ولادت سے تین ہزار قبل سامیوں کا دوسرا نقل وطن ہوا۔ جس نے ہلالِ اخضر نامی وادیوں کے اموری لوگوں کو جنم دیا۔ اموریوں میں کنعانی اور ساحلوں کے یونانی فونیقی شامل تھے۔ ان فونیقیوں نے دنیا میں پہلی بار لکھنے کیلئے حروفِ حبی کے نظام کو ایجاد کیا جس میں ہر حرف یا آواز کے بائیس نشانات تھے۔ یہ دنیا کی عظیم ترین ایجاد سمجھی جاتی ہے جس نے انسانی تہذیب کو خاص ترقی سے ہم کنار کیا۔

(۴) ۱۵۰۰ ق م اور ۱۶۰۰ ق م کے درمیان عبرانی لوگ جنوبی شام اور فلسطین پہنچے جب کہ آرامی یا شامی لوگ شمال میں جا بے تھے۔ عبرانیوں نے دنیا میں پہلی بار توحید الہی کا واضح عقیدہ اور حقیقت پیش کی اور یہی عقیدہ توحید اسلام، عیسائیت اور تمام آسمانی مذاہب میں مشترک ہے۔

(۵) ۵۰۰ ق م کے قریب نبٹیوں (NABATAENS) نے جزیرہ سینا کے مشرق میں اپنی سلطنت قائم کر لی اور شاندار عمارتیں تعمیر کیں جن میں اب بھی بہت سی بطرا (PETRA) میں موجود ہیں۔ یہ ان کی تہذیب و تمدن کے عروج کا زمانہ تھا۔

(۶) ساتویں صدی عیسویں میں سامیوں کا آخری نقل وطن اسلام کے پرچم تلے ہوا جب انہوں نے زرخیز ہلال کے علاقے، عراق و شام فلسطین اور مصر کے فتح کر کے ایک عالمی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ بعد میں اس ریاست کے مغرب میں واقع شمالی افریقہ اور اندلس اور مغرب میں موجودہ ایران و ترکستان اور پورے ایشیا پر قبضہ کر لیا۔ جزیرۃ العرب کو سامی نسل کا اصل علاقہ قرار دینے والے مورخین اور ماہرین لسانیات اس آخری سامی ہجرت کو اپنے نظریہ کا سب سے بڑا ثبوت بتاتے ہیں کیوں کہ یہ ہجرت تاریخ کی پوری روشنی میں ہوئی ہے۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ عربوں میں سامی خصوصیات، جسمانی اور ذہنی دونوں کمال درجہ پر پائی جاتی ہیں پھر ان کے بعد یہودیوں میں ملتی ہیں لیکن عربوں کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔

دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ سامیوں کی یہ ہجرتیں تقریباً ایک ہزار سال کے وقفہ سے ہوتی رہیں۔ جب ان کی آبادی نقطہ اعتدال سے بڑھ جاتی تھی تو فاضل آبادی کو دوسرے علاقوں میں کھانا پانی اور دوسری سہولیات کی تلاش میں جانا پڑتا تھا ان کے نقل وطن کی صورت یہ ہوتی تھی کہ پہلے کچھ لوگ روانہ ہوتے، دوسرے ان کے پیچھے پیچھے جاتے اور پھر خاصی بڑی تعداد میں لوگ وطن سے نکل جاتے۔

اس نقل مکانی کی ایک اور خصوصیات یہ تھی کہ بدوی طرز زندگی اور مویشی پالنے والے لوگ اپنی خانہ بدوش زندگی سے ترقی کر کے مستقل رہائش کی تہذیب اپناتے اور مستقل تہذیب والے مقيم لوگ بن جاتے۔ ہجرت کر کے جانے والے جاتے رہے۔ لیکن اصل باشندے اپنے گھروں میں ہی مقيم رہے اور بعد میں انہوں نے ہی اسلامی تاریخ بنائی اور اسلامی تہذیب قائم کر کے پوری دنیا میں روشنی پھیلائی۔

عربوں کی نسلی تقسیم:

دوسری طرف عربوں کی نسلی تقسیم کرنے والے کہتے ہیں کہ ان کی تین نسلیں ہیں:

اول۔ عرب باندہ:

جو ملک کے اصل باشندے تھے اور اسلام کی آمد سے قبل صدیوں پہلے ناپید

ہو چکے تھے ان کو بنو آرام یا آرامی قوم کہا جاتا ہے۔ ان میں عاد (اول اور دوم) معین کے علاقہ، ثمود، طسم و جدیس، شام و شمالی حجاز کے علاقہ مشہور نسلیں تھیں۔ ان کے علاوہ عبیل، عبد ضخم اور جرہم وغیرہ بھی دوسری نسلیں شامل تھیں۔ ان میں سے عاد و ثمود کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔

دوم۔ عرب عاربہ:

جو (قحطان کی اولاد) کہلاتے ہیں اور عرب باندہ کے بعد وہی عرب کے اصلی باشندے تھے۔ ان کا اصل وطن جنوبی عرب کا علاقہ..... یمن، حضرموت وغیرہ..... تھا جہاں سے وہ نقل وطن کر کے وسطی اور شمالی عرب کے علاقوں میں آکر مدتوں پہلے بس گئے تھے۔ ان میں اہم ترین لوگ مدینہ منورہ کے انصار تھے۔ ان کے دونوں عرب قبیلے..... اوس و خزرج..... جنوبی عرب کے قبیلے اور قحطانی تھے۔ مدینہ کے بعض یہودی قبیلے بھی جنوبی عرب کے تھے۔ قدیم زمانہ میں قوم سباسب سے زیادہ متمدن عرب عاربہ تھے۔ عرب قبیلوں میں حمیر، کہلان اور تہج بھی ان ہی سے متعلق تھے۔

سوم۔ عرب مستعربہ:

جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند اکبر حضرت اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور بنو عدنان کہلاتے تھے۔ مغربی ساحلی پٹی..... حجاز..... کے علاقوں او شہروں میں ان کی اہم بستیاں تھیں۔ ہمارے رسول اکرم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ قریش اسی نسل سے تھا۔

قدیم عرب سلطنتیں

جنوبی عرب خاص کر اور شمال کے زرخیز ہلال کے علاقوں میں بالعموم سامی نسل کے لوگ سب سے پہلے تہذیب سے آشنا ہوئے۔ انہوں نے غیر معمولی ترقی کی۔ اور اپنے اپنے علاقوں میں کئی چھوٹی بڑی سلطنتیں قائم کیں جن میں سے پانچ جنوبی عرب میں اور پانچ شمالی کے جزیرہ سینا اور اس کے جوار میں تھیں۔

جنوبی عرب کی سلطنتیں :

سلطنت سبا:

قوم سبا کا وطن جزیرہ العرب مغربی کو نہ تھا جہاں آج یمن کا ملک اودن کا شہر ہے۔ اس علاقہ کی سرسبزی، سمندر سے اس کی قربت، ہندوستان کے راستے پر فوجی اور تجارتی لحاظ سے اہمیت حاصل تھی۔ قوم سبا کی محنت و تجارت نے ان کو تہذیب و تمدن کے عروج پر پہنچا دیا۔ ان کے علاقے میں بہت سے مسالے اور خوشبوئیات پیدا ہوتی تھیں جو نہ صرف قیمتی تجارتی چیزیں تھیں بلکہ مذہبی زندگی میں بھی ان کی اہمیت تھی بین الاقوامی تجارت کے ناکہ پر ہونے کے سبب قوم سبا کو مختلف ملکوں سے قیمتی اور نادر چیزیں ملتی تھیں۔ جیسے خلیج فارس سے موتی جواہرات، ہندوستان سے کپڑے اور تلواریں، چین سے ریشم، حبشہ سے غلام، ہاتھی دانت کی چیزیں، سونا اور دوسری اشیاء یہ قیمتی سامان تجارت ان کے ذریعہ ہی مغربی ملکوں میں پہنچتا تھا۔

قوم سبا ہر تجارت پیشہ ہونے کے علاوہ بحری راستوں اور سمندروں سے بھی خوب واقف تھی اور ان اسباب سے وہ جنوب و شمال دونوں علاقوں سے بین الاقوامی تعلقات رکھتی تھی ان اسباب سے قوم سبا نے تاریخ عرب میں پہلی سلطنت قائم کی۔ یہ سلطنت ۵۰۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک قائم رہی۔ شروع میں یہ مذہبی سلطنت تھی جس پر مذہبی سردار (پروہت) حکومت کرتا تھا اور اس کا لقب مکرب تھا۔ ان کے کئی بادشاہوں نے اس دوران راج کیا۔ اپنے عروج کے زمانے میں سبا کے حکمرانوں نے قرب و جوار کے تمام علاقوں پر بلکہ پورے جنوبی عرب پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے اپنی معاصر اور پڑوسی سلطنت معان کے علاقے چھین کر ان کو اپنا باج گزار بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ شہر مارب کے مغرب میں ایک دن کی مسافت پر ان کا دارالحکومت ”سرواح“ تھا۔

دارالسلطنت کی سب سے اہم عمارت ان کا مندر تھا جو المکہ یعنی چاند دیونا کا مندر تھا ان کے پرانے کتبات سے ان کے مختلف حکمرانوں کے نام معلوم ہوتے ہیں اور ان کی عمارتوں اور کارگزاریوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۱۰ ق م سے سلطنت سبا کا دوسرا دور شروع ہوا جو کئی صدیوں تک جاری رہا۔ اس دوران سب سے بڑا انقلاب یہ آیا کہ ان کا حکمران مذہبی اختیارات اور مقام سے محروم ہو گیا اور خالص دیناوی بادشاہ بن گیا۔ سرواح کی جگہ صنعاء شہر اس کا صدر مقام یا پایہ تخت بن گیا۔ صنعاء بین الاقوامی تجارتی شاہراہوں کے سنگم پر واقع تھا۔ دوسرا اہم شہر مارب تھا جو دراصل اپنے بن کی وجہ سے مشہور تھا اور جس کی سد مارب کہا جاتا تھا ویسے مارب شہر میں تین قلعے تھے۔ ”سد مارب“ کچا مٹی کا بند تھا اور وہ اپنے زمانے کا عظیم ترین بند تھا اور اہم انجینیری شاہکار سمجھا جاتا تھا۔ وہ کئی بار بنا اور کئی بار پانی کے سیلاب سے ٹوٹا۔ اس کے قدیم ترین حصے ساتویں صدی قبل مسیح کے تھے۔ اس کے بعض کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بنانے والے پہلے نیوف (SUMHU, ALAY YANOF) اور اس کا فرزند یھمر (YATH, AMER) تھے۔

ان کی مرمت کا کام پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں کیا گیا تھا

سلطنت معان:

سلطنت سبا کی ہم زمانہ اور پڑوسی تھی۔ وہ یمن کے اندرونی علاقہ میں پروان چڑھی جس کو جوف الیمن کہا جاتا ہے اور اپنی ترقی کے زمانہ میں جنوبی عرب کے بیشتر علاقوں پر قابض تھی۔ اس کا صدر مقام قرناؤ تھا جو جوف یمن کے وسط میں واقع تھا، جہاں آج جدید شہر معین پایا جاتا ہے۔ وہ صنعاء کے شمال مشرق میں ہے۔

ان کا مذہبی صدر مقام یٹیل (YATHIL) بھی جوف یمن میں تھا جو آج کل براقیش کہلاتا ہے اور وہ مارب کے شمال مشرق میں ہے۔

سلطنت معان کے لوگ وہی زبان بولتے تھے جو قوم سبا بولتی تھی بس معمولی لہجے کا فرق تھا

سلطنت قطبان:

جنوبی عرب کی تیسری بڑی سلطنت تھی۔ ان کا علاقہ عدن کے مشرق میں واقع تھا۔ ان کا صدر مقام تمنع تھا جو اب کہلان کہلاتا ہے۔ یہ سلطنت ۴۰۰ اور ۴۵۰ ق م میں موجود تھی اور صرف پچاس سال زندہ رہ سکی۔ اس پر کبھی معان کی سلطنت کا اور کبھی سلطنت سبا کا قبضہ ہوتا رہا۔

سلطنت حضر موت:

اپنے موجودہ نام کے علاقہ میں موجود ہے۔ اور اس کا صدر مقام شبوہ تھا جو سیوتہ کہلاتا تھا۔ یہ سلطنت پانچویں صدی قبل مسیح سے پہلے سے پہلی صدی عیسوی کے آخر تک جاری رہی۔ سلطنت قطبان کی مانند وہ کبھی سلطنت سبا کی اور کبھی سلطنت معان کی محکوم رہی۔ قدیم عرب ان سلطنتوں کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔

سلطنت حمیر یا حمیری سلطنت:

۱۱۵ ق م سے یہ پورا علاقہ حمیر قبیلہ کی سلطنت کا ماتحت بن گیا۔ یہ لوگ جنوب مغرب کے علاقے کے رہنے والے تھے۔ ان کی تہذیب کو حمیری کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کا شاہی خطاب یا لقب شاہ سبا اور ذور یدان برقرار رہا۔ ریدان ہی بعد میں قطبان کے نام سے معروف ہوئے۔

یہ پہلی حمیری سلطنت کی ابتدا تھی جو تقریباً ۳۰۰ء تک جاری رہی۔

حمیری قوم سبا کے قریبی رشتہ دار یا اولاد تھے اور اپنی نسل و قوم کے نئے نمائندے وہ سبا اور معان دونوں کی تہذیب و تجارت کے وارث بنے تھے۔ ان کی زبان بھی وہی تھی۔ ان کے کتبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ زراعت میں انھوں نے کافی ترقی کی تھی کیوں کہ ان کے تعمیر کردہ بندوں۔ کنوؤں اور نالیوں کا بہت ذکر ملتا ہے۔ ظفار حمیری سلطنت کا دارالحکومت تھا جس نے سب کے مارب اور معان کے قرناؤ کی جگہ لے لی تھی۔

اس دور کا ایک اہم واقعہ عرب پر روم کا حملہ ہے۔ اور دوسرا واقعہ یمن و حضر موت کے عربوں کا حبشہ میں کش سلطنت کا قائم کرنا ہے۔ یہ سلطنت اکسوم کے نام سے معروف ہے۔ اس کے قیام کے بعد سامی عربوں اور مقامی نیگروں میں نسلی اختلاط ہوا۔ حمیری سلاطین نے بدوی عرب قبیلوں کے حملوں سے بچنے کیلئے کئی مضبوط قلعے بھی تعمیر کیے تھے۔ جن میں غمدان کا قلعہ بہت مشہور تھا۔ وہ بیس منزلہ عظیم الشان قلعہ تھا۔

حمیری سلاطین نے سونے چاندی اور تانبے کے سکے بھی چلائے تھے جن پر ان کی تصاویر ہوتی تھیں اور دوسری ”الو“ یا ”بیل“ کی شبیہ ہوتی تھی۔ حمیری سماج قدیم قبائلی نظام، ذات پات کے طریقہ اور جاگیردارانہ اشرافیہ کی ملی جلی خصوصیات رکھتا تھا۔ جس میں بادشاہت بھی شامل تھی۔ حمیری سلطنت کے ہاتھوں میں جب تک تجارت رہی وہ قوت کے مالک رہے لیکن بعد میں ان کو دوسری قوموں کے لئے جگہ خالی کرنا پڑی۔

۳۰۰ء میں دوسری حمیری سلطنت قائم ہوئی جو تہامہ کے علاقہ تک وسیع تھی۔ اس دوران ۳۲۰ء تا ۳۷۸ء میں حبشی حملہ کے نتیجہ میں ایک حبشی حکومت قائم رہی۔ پھر حمیریوں نے اپنی سلطنت دوبارہ قائم کر لی جو ۵۲۵ء تک جاری رہی۔ کتبات سے اس دور کے نو حمیری بادشاہوں کے نام معلوم ہیں جو تبع کہلاتے تھے۔ ان میں شمریر عیش اور ابو کریب اسعد کامل بہت مشہور تھے۔ وہ عظیم فاتح بھی تھے۔ موخر الذکر نے یہودیت اختیار کر لی تھی۔

شمالی عرب کی سلطنتیں:

جنوبی عرب کی بعض سلطنتوں کی مانند شمال میں بھی کچھ بادشاہیتیں عرب قبیلوں نے قائم کر لی تھیں:

نبطی سلطنت:

ان میں سب سے اہم تھی۔ اس کی سب سے بڑی طاقت تجارت تھی۔ بلکہ یہ تمام سلطنتیں تجارت ہی کے بل بوتے پر قائم تھیں اور وہ اپنے آغاز یا ترقی دونوں کے کسی مرحلہ میں بھی فوجی طاقت نہیں رہی تھیں نبطی سلطنت سب سے پہلے قائم ہوئی تھی۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں نبطی یا الانباط اردن کے علاقے سے آکر ادومی (EDOMITES) کے علاقے میں آئے اور پھر ان سے بطراء (PETRA) چھین لیا۔ رفتہ رفتہ نبطیوں نے اپنے دارالحکومت کے ارد گرد کے علاقوں پر قبضہ جمالیا۔ ان کا صدر مقام ایک سطح مرتفع پر واقع تھا جو تین ہزار فیٹ بلند تھی۔ چوتھی صدی قبل مسیح خاتمہ سے لے کر چار سو سال تک ان کا دارالحکومت سلطنت سبا اور بحر روم کے درمیان ہونے والی تجارت کا سب سے اہم مرکز بنا رہا۔ وہ پہلی صدی عیسوی میں دولت مندی اور خوشحالی کے اوج کمال پر پہنچا۔

نبطیوں نے اتنی طاقت پیدا کر لی تھی کہ غیر ملکی حملہ آوروں کے معتد حملوں کو پسپا کر دیا پہلے وہ یونانی سلطنت کے زیر اثر تھے پھر وہ رومیوں کے حلیف بن گئے۔ بادشاہ حارثہ (۶۲-۸۷ ق م) نے پہلی بار سکے جاری کئے۔ رومی شہنشاہ جولیوس سیزر نے نبطی حکمران مالک سے فوجی مدد مانگی تھی۔ نبطی عربی زبان بولتے تھے لیکن ان کا رسم خط آرامی تھا۔ کیوں کہ آرامی ان کی تجارتی زبان ہونے کے علاوہ علمی زبان بھی سمجھی جاتی تھی۔

نبطی لوگ بت پرست تھے اور ان کی سب سے بڑی دیوی ذوالشعریٰ تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارتی شاہراہ مشرق کی جانب ہٹتی گئی اور اسی کے ساتھ پٹرا کی نبطی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ جب کہ تجارتی شاہراہ کے قریب آنے کے سبب پامیر یا نے ترقی کی ۵۰ء میں رومی سلطنت نے پٹرا پر قبضہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔

پامیر یا پامد مور کی سلطنت:

بادیۃ الشام (شامی صحرا) کے درمیان میں ایک عظیم الشان نخلستان تھا جو تدمور یا پامیریا کہلاتا تھا۔ ہندوستان اور جنوبی ایشیا سے تجارتی شاہراہ کے مشرق میں ہٹنے کے سبب اس کی ترقی اور عروج شروع ہوا۔ مہطیوں کی مانند یہ لوگ بھی عمارت سازی کے فن میں طاق تھے اور انہوں نے اپنے عہد عروج میں شاندار عمارتیں بنائی تھیں۔

دو حریف سلطنتوں پارتھیا اور روم کے درمیان واقع ہونے کے سبب پامیریا کو اپنی حفاظت کے لیے ان دونوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو متوازن بنانے اور غیر جانبداری کی پالیسی اپنانے کی ضرورت تھی۔ تازہ پانی کی کافی فراہمی کے سبب تجارتی کارواں اس کے علاقے سے ہو کر گزرنے لگے اور مشرقی اور مغربی دونوں علاقوں کی تجارت کے درمیان واقع ہونے کی بنا پر وہ ترقی کرتی گئی۔

پہلی صدی قبل مسیح سے پہلے ہی پامیریا تجارتی مرکز بن گیا تھا۔ پھر جلد ہی وہ رومی سلطنت کے زیر اثر آگیا۔ ۱۳۰ء اور ۲۷۰ء کے درمیان پامیریا کی خوش حالی اور طاقت عروج پر تھی اس کی بین الاقوامی تجارت اس زمانے میں چین کی سرحدوں تک جا پہنچی تھی۔ اور وہ پٹرا کی صحیح جانشین بن گئی تھی مگر ملکہ زینوبا کے عہد میں ۲۷۲ء کے عہد میں رومیوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہمیشہ کے لیے اس کو ختم کر دیا۔ پامیری تہذیب صحیح معنوں میں یونانی شامی اور پارستھی اور ایرانی تہذیبوں کا سنگم تھی۔

سلطنت کندہ:

نجد میں قبیلہ کندہ کی ایک نسبتاً معمولی سلطنت قائم ہوئی۔ یہ قبیلہ بھی جنوبی عرب کا تھا۔ اس کو عرب قبیلہ بنو اسد اور ایران کی ساسانی حکومت کا تعاون حاصل تھا۔ بنو اسد نے ہی اس سلطنت کا خاتمہ کیا اس کا آخری بادشاہ مشہور عرب امرؤ القیس کا باپ حجر تھا۔ بعد میں بنو کندہ نے دو متہ الجندل کے علاقہ میں سلطنت قائم کی۔ دو متہ الجندل ہی اس کا پایہ تھا۔ اس کا آخری حکمران اکیدر بن عبد الملک تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی ریاست کا باجگدار بن گیا تھا۔ بعد میں وہ اسلامی ریاست میں مدغم ہو گئی۔ اس کے دوسرے حصہ پر بنو کلب کا قبضہ تھا۔ جو

عہد نبوی میں مسلمان ہو گیا۔

غسانی سلطنت:

غسانی اگرچہ شمال میں شامی سرحدوں کے پاس آکر بس گئے تھے لیکن وہ جنوبی عرب کے ایک قبیلہ کے لوگ تھے۔ ان کا پیش رو اور جد امجد یمن سے بھاگ کر حوران اور بقاء چلا گیا۔ یہ تیسری صدی عیسویں میں مارب کے بند ٹوٹنے کے بعد کا واقعہ ہے۔ جفہ بن عمرو کو اس سلطنت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

غسانیوں نے شام میں عرب حکومت کا خاتمہ کیا اور اس کی جگہ اپنی سلطنت قائم کی وہ دمشق کے جنوب مشرق میں واقع شہر مارب اور دمشق کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھی دھیرے دھیرے غسانی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے شامی اور مذہب کے لحاظ سے عیسائی ہو گئے۔ وہ عربی زبان کے ساتھ شام کی آرامی زبان بولنے لگے۔

پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں غسانی حکمران بازنطینی سلطنت کے زیر اثر آ گئے اور بدوی قبائل کے خلاف ایک دیوار بن گئے۔ ان کا صدر مقام کچھ مدت کے بعد شہر جابیہ بن گیا۔ غسانی سلطنت اپنی حریف لخمی سلطنت کی مانند چھٹی صدی عیسوی میں عروج پر پہنچی۔ اس صدی میں حارث بن جبلة غسانی (۶۹-۵۲۹ء) اور منذر سوم لخمی نے عرب تاریخ میں نام پیدا کیا۔ حارث غسانی نے زیادہ تر رومیوں/بازنطینیوں کے لیے جنگیں لڑیں۔ اس کا فرزند منذر اس کا جانشین بنا پھر العمان حکمران ہوا۔ بعد میں سیاسی انتشار پیدا ہوا۔ پہلے ایرانی شاہ خسرو پرویز نے اور پھر اسلام نے ان کی طاقت توڑ دی۔ بالآخر خلافت فاروقی میں یہ سلطنت اسلامی ریاست کا حصہ بن گئی۔

لخمی سلطنت:

یمنی قبیلہ تنوخ کی ایک شاخ بنو لخم نے دریائے فرات کے مغربی زرخیز علاقے میں سکونت اختیار کی۔ وہ رفتہ رفتہ اس پورے علاقے کے مالک بن گئے۔ حیرہ پہلے خیموں کا شہر تھا جو بعد میں باقاعدہ شہر اور ان کی راجدھانی بن گیا۔ غسانیوں کے برخلاف لخمی سلطنت ایران کی ساسانی

سلطنت کی ماتحت و باجگذار تھی۔ ان کی زیادہ تر آبادی عیسائی بن گئی تھی۔ روایت کے مطابق مالک بن فہم ازدی اس سلطنت کا بانی تھا لیکن اصل بانی عمرو بن عدی تھا۔ یہ سلطنت تیسری صدی عیسوی کے اواخر میں قائم ہوئی اس کے کم و بیش بیس حکمران ہوئے جن میں امروالقیس بہت مشہور ہوا اور پھر اس کا جانشین نعمان جس نے ۸۱۰ء میں حکومت کی۔ بلاشبہ وہ عظیم حکمران تھا۔ شاعروں کا سرپرست اور عظیم معمار تھا نعمان کے فرزند منذر کے عہد میں حیرہ کی لخمی سلطنت اپنے عروج پر تھی۔ جس نے چوالیس سال حکومت کی نعمان سوم (۶۰۲ء - ۵۸۰ء) کے عہد میں حیرہ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے دوران اس پر اسلامی قبضہ ہو گیا۔

عربوں کا قبائلی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام

قبائلی تنظیم:

عربوں کا سماج قبائلی تھا یعنی عرب کے تمام باشندے بہت سے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے اور وہ سب ایک دوسرے کے خون کے رشتہ دار تھے۔ قبائلی نظام خون کے رشتہ پر مبنی تھا۔ باپ کی طرف سے سلسلہ چلتا تھا اس لیے پدری (PATERNAL) نظام تھا جو ماں کے قبیلہ ہمیشہ اچھے تعلقات رکھتا تھا۔ ہر بڑا قبیلہ اپنے تمام معاملات میں آزاد و خود مختار تھا۔ عام طور سے بڑے قبیلہ کی آبادی پانچ چھ ہزار انسانوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

بعض بڑے قبیلے آٹھ دس ہزار تک آبادی والے تھے جیسے قریش، ہوازن اور غطفان وغیرہ متوسط درجہ کے قبیلہ کی آبادی تین چار ہزار اور چھوٹا قبیلہ بالعمول پانچ سو سے پندرہ سو افراد کی آبادی پر مشتمل ہوتا تھا۔

بعض دوسرے قدیم سماجوں کی مانند قبائلی نظام میں بھی طاقت و سماجی عزت کا دار و مدار تعداد یا عددی قوت پر ہوتا تھا۔ جتنی زیادہ تعداد اتنی ہی طاقت اور اتنی ہی سماجی عزت۔ اس لیے ہر قبیلہ اپنی تعداد زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے دو طریقے تھے۔ اول قدرتی (NATURAL) اور دوسرا مصنوعی (ARTIFICIAL)۔

قدرتی طریقہ یہ تھا کہ ایک مرد بیک وقت کئی کئی عورتوں سے شادی کر لیتا تھا اس کو تعدد از دواج (POLYGAMY) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اکثر حالات میں ان میں

سے ہر شخص کی بہت ساری اولادیں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ عربوں میں باندیاں / کنیریں رکھنے کا رواج (CONCUBINAGE) بھی عام تھا۔ یعنی ایک مرد کئی کئی عورتوں کو بطور غلام بازار سے خرید لیتا تھا یا جنگی قیدیوں میں سے عورتوں کو لے کر رکھ لیتا تھا اور ان سے اپنی بیویوں کی طرف تعلقات رکھتا تھا۔ ان سے بھی اولادیں ہوتی تھیں۔ اس طرح آبادی میں دو گنا چو گنا اضافہ ہوتا تھا۔

مصنوعی رشتے تین قسم کے تھے اور ان کی بنیاد خون کے رشتہ پر نہیں ہوتی تھی بلکہ معاہدہ، دوستی اور تعلق پر تھی۔

اول: حلف کا رشتہ: دو یا دو سے زیادہ افراد یا قبیلے ایک دوسرے کے ساتھ دوستی اور باہمی تعاون کا معاہدہ مساوات یا برابری کی سطح پر کر لیتے تھے تو ان کا تعلق حلف کا ہوتا تھا اور وہ ایک دوسرے کے حلیف (جمع خُلَفَاء) کہلاتے تھے جیسے قبیلہ قریش اور قبیلہ کنانہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ یا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی / قریشی نے ابو مرثد غنوی / قیس عیلان کے ساتھ حلف کا معاہدہ کیا تھا اور دونوں فرد ایک دوسرے کے حلیف تھے۔

دوم: دلاء کا رشتہ: عام طور سے ایک کمزور فرد یا قبیلہ ایک طاقتور فرد یا قبیلہ سے دوستی اور تعاون کا معاہدہ کرتا تھا یا کمزور طاقتور کے سایہ میں آجاتے تھے اس کو دلاء کا رشتہ کہتے تھے اور کمزور فرد یا قبیلہ، سرپرست فرد یا قبیلہ کا مولیٰ (جمع موالی) کہلاتے تھے عام طور سے اسے لوگ اپنے قبیلہ یا علاقہ سے کٹ کر کہیں اور جاتے تھے تو ان کو یہ رشتہ قائم کرنا ضروری ہوتا تھا۔ ورنہ ان کی حفاظت کی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔

یہ رشتہ آزاد افراد اور قبیلے بھی کرتے تھے اور آزاد ہونے کے بعد غلام بھی۔ غلام عام طور سے اپنے پرانے آقا سے ہی یہ رشتہ استوار کر لیتے تھے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کلبی آپ کے مولیٰ تھے۔ اسی طرح اور بہت سے آپ کے موالی تھے۔ حضرت سلمان فارسی آزادی کے بعد آپ کے مولیٰ بنے تھے۔ جب کہ حضرت خباب بن الارت تمیمی آزاد فرد تھے مگر حضرت عتبہ بن غزو ان کے مولیٰ تھے اور خود حضرت عتبہ

قریش کے خاندان بنونوفل کے حلیف تھے۔ بنو امیہ کے موالی کافی مشہور خاندان تھے جیسے قبیلہ اسد خزیمہ کے خاندان بنو غنم بن دودان وغیرہ۔

سوم: جوار کا رشتہ: جو عارضی ہوتا تھا، اس کے معنی پڑوس کے ہیں اگر کمزور کسی طاقت ور شخص کی پناہ میں عارضی طور پر آجاتا تھا جو جار (پڑوسی = جمع حیران) کہلاتا تھا۔ عبدالمطلب بن ہاشم قریشی نے ایک یہودی تاجر کو اپنا ”جار“ بنالیا تھا۔ طائف کے سفر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچازاد خاندان بنونوفل کے سردار مطعم بن عدی کی جوار لی تھی۔ جب کہ حضرت ابوبکر صدیق نے احابیش کے سردار ابن الدغنه کی عارضی جوار قبول کی تھی۔ عام طور سے یہ جوار دوسرے خاندان یا قبیلہ کے فرد کو دی جاتی تھی جب کہ اس فرد کا خاندان اس کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔

ان تمام مصنوعی رشتوں کے ذریعہ جو لوگ کسی قبیلہ سے تعلق قائم کرتے تھے۔ وہ اسی کے افراد و ارکان شمار ہوتے تھے۔ خواہ حلیف ہوں یا مولیٰ یا جار۔ ان مصنوعی رشتہ داروں کو ہر حال میں اپنے سرپرست قبیلوں کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ جنگ و امن دونوں صورتوں میں اس طرح قبیلوں کی عددی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔ دوسری طرف سرپرست قبیلے، خاندان یا افراد اپنے حلفاء موالی اور حیران کی حمایت و حفاظت کرتے تھے۔

قبیلہ کی بناوٹ:

عرب کی قبائلی تنظیم میں سب سے بڑی اکائی (UNIT) ہوتی تھی جب کہ سب سے چھوٹی اکائی شخص افراد ہوتا تھا۔ چند افراد جو خون کے رشتہ دار ہوں وہ ایک گھرانہ / خاندان (FAMILY) بناتے تھے۔ ایسے کئی قریبی خاندان مل کر ایک خانوادہ / آجی (CLAN) بناتے تھے۔ اور کئی رشتہ دار آجی / خانوادے مل کر ایک قبیلہ (TRIBE) بناتے تھے۔ چھوٹے اور متوسط قبیلے عام طور سے ایک ہی علاقہ میں رہتے بستے تھے۔ جب کہ بڑے قبیلے مختلف علاقوں میں اپنی تعداد کی کثرت کے سبب جا بستے تھے۔

قبیلے کی بناوٹ کے دو طریقے تھے: نیچے سے اوپر چلیں تو افراد، خاندانوں اور خانوادوں

اور قبیلہ اور قبیلہ کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور قبیلہ بڑے سے بڑا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ قبیلہ بہت بڑا ہو جاتا اور ایک سماجی / قبائلی اکائی کی طرح کام نہ کر سکتا تو اس کے خانوادے قبیلے بن جاتے اور یہ سلسلہ نیچے تک چلا جاتا۔ مثال کے طور پر قریشی کا قبیلہ کافی زمانے پہلے ایک خاندان تھا اور فہر بن مالک کے زمانے تک بنو فہر کہلاتا رہا۔ پھر اس کے خاندانوں، خانوادوں کے افراد کی تعداد بڑھتی گئی تا آنکہ وہ قبیلہ بن گیا جس کے دس بارہ بڑے بڑے خانوادے تھے پھر یہ خانوادے اتنے بڑے ہو گئے کہ خود قبیلے بن گئے۔

ہر خاندان اور ہر خانوادہ کے سردار ہوتے تھے۔ جو عمر، تجربہ اور اپنے اوصاف کی بنا پر چنے جاتے تھے۔ ان کے عہد کا موروثی ہوتا ضروری نہیں تھا مگر اکثر ہوتا تھا۔ قبیلہ کا کوئی سردار انہیں میں سے ہوتا تھا مگر وہ قبیلے کے سارے کام دوسرے تمام سرداروں کے مشورہ سے کرتا تھا۔

اقتصادی نظام:

عربوں کی پوری زندگی جغرافیائی حالات سے متاثر ہوئی تھی لہذا ان کو دو بڑے اور ممتاز حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک دیہی / صحرائی آبادی تھی جو بدوی یا بدو (اہل البداءہ) کہلاتی تھی اور دوسری شہری یا مہذب آبادی جو اہل الحضارۃ کے نام سے جانی جاتی تھی۔ ان دونوں کا اقتصادی نظام ان کے سماجی نظام کی طرح کافی مختلف تھا۔

بدو زیادہ تر ریگستانی علاقوں کے باشندے تھے۔ اس لیے وہ خانہ بدوش (MIGRATORY) تھے اور کسی ایک جگہ جم کر نہیں رہتے تھے وہ موسم سرما میں سرمائی خطہ کے مختلف علاقوں میں پانی، کھانے اور چارے کی تلاش میں مارے مارے پھرا کرتے تھے اسی طرح گرمی میں گرمائی خطوں میں۔

ان کا سب سے بڑا سہارا اور معاشی ذریعہ جانور پالنا (STOCK BREEDING) تھا۔ جن میں بھیڑ بکری اور اونٹ خاص ہوتے تھے۔ اونٹ تو ان کے بہت کام آتا تھا وہ اس کا دودھ پیتے، بالوں سے اون پاتے، جن سے کپڑے کپل اور خیمے بناتے۔ وہ ان کی سواری کا جانور بھی تھا۔ وہ پانی بھی فراہم کرتا تھا اور کبھی کبھی گوشت بھی دیتا تھا۔

ویسے ان کی زیادہ تر غذا جانوروں کا دودھ تھا۔ گوشت بھی وہ کھاتے تھے لیکن کم۔ اناج بالکل نہیں کھاتے تھے۔ کھجوریں کبھی کبھی ان کو قافلوں، کاروانوں یا شہروں یا نخلستانوں سے مل جاتی تھیں۔ ریوڑ پالنے کے سوا ان کا دوسرا پیشہ لوٹ مار کرنا تھا جس کو ”رزیہ“ کہتے تھے۔ وہ ان کی سماجی روایات میں برا نہیں بلکہ قابل فخر سمجھا جاتا تھا چنانچہ وہ اکثر کاروانوں اور بستیوں کو لوٹ لیتے تھے۔ کبھی کبھی آپس میں بھی لڑ پڑتے تھے۔ قیدی عورتوں، بچوں اور مردوں کے بدلے میں وہ فدیہ (RANSOM) میں ضرورت کی چیزیں طلب کرتے اور پاتے تھے یا ان کو غلام بنا کر بازاروں میں بیچ دیتے تھے۔

صرف چار مقدس مہینوں..... رجب، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم..... میں امن رہتا تھا کہ وہ ان میں لوٹ مار نہیں کرتے تھے لیکن ”نسی“ کے قاعدے کے تحت وہ ان مقدس مہینوں کو ادلتے بدلتے رہتے تھے۔ لوٹ مار سے بچنے کیلئے متمدن عرب بدوی قبیلوں سے دوستی کے معاہدے کر لیتے تھے اس کے بدلے میں وہ ان کے کاروانوں کو اپنے علاقوں سے بحفاظت گزرنے دیتے تھے اور عوض میں ضرورت کی چیزیں پاتے تھے۔

بدو عربوں کا رہن سہن بڑا سیدھا سادا تھا۔ وہ عام طور سے کمبلوں یا چمڑوں کے بنے ہوئے خیموں میں رہتے تھے۔ ان کا لباس موٹے اون یا کمبل کا بنا ہوا ہوتا تھا۔ برتن لکڑی کے ہوتے تھے اور وہ بھی معمولی۔ جانوروں کے لیے وہ پانی برسات کے گڑھوں سے حاصل کرتے تھے یا برساتی تالوں سے پاتے تھے۔ اونٹ ان کے جانوروں کے لیے پانی اپنے پیٹ میں رکھتا تھا جسے وہ وقت ضرورت حاصل کر لیتے تھے۔ بارش کے پانی کو وہ چھوٹے چھوٹے تالابوں میں جمع کر لیا کرتے تھے۔ ریگستانوں میں عام طور سے معمولی جھاڑ، خاص کر جھاؤ ہوتی تھی یا معمولی گھاس اور کانٹے دار جھاڑیاں وہ ان کے جانوروں کے چارے کے کام آتی تھیں۔

شہری آبادی: (اہل الحصارۃ)

بدو قبائل کے برعکس شہری متمدن قبائل مستقل طور سے نخلستانوں، دیہاتوں، شہروں وادیوں اور پہاڑوں میدانوں میں رہتے تھے اور نسبتاً مہذب تھے۔ اس کا بنیادی سبب پانی،

کھانے اور بعض دوسری بنیادی چیزوں کی نسبتاً آسان فراہمی تھی۔ ان کا قبائلی نظام بدوؤں کی مانند تھا۔ البتہ ان کی سماجی اور خاص کر اقتصادی اور سیاسی زندگی میں کافی فرق تھا۔

شہری اقتصادی نظام:

مستقل سکونت کی تہذیب کی پہلی دین یہ تھی کہ شہری قبائل نے اپنی روزی روٹی کمانے کے ڈھنگ سیکھ لیے تھے اور وہ بنیادی طور سے چار تھے: (۱) تجارت (۲) زراعت (۳) حرفت (۴) مزدوری۔

جاہلی تجارت:

بعثت نبوی سے کئی صدیاں پہلے عربوں نے تجارت کا فن سیکھا۔ پہلے وہ مقامی تجارت کرتے تھے اور اس کا زیادہ تر انحصار چیزوں کے تبادلہ کے نظام (BARTER SYSTEM) پر تھا یعنی چیز دے کر چیز لینا۔ یہ نظام سکوں (CURRENCY) کے نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے چلا تھا اور سکہ نظام کے آنے کے بعد بھی چلتا رہا کیوں کہ سکے آسانی سے دستیاب نہ تھے اور نہ عرب میں ڈھالے جاتے تھے۔

شروع میں خوانچہ فروشی (VENDING) یعنی محلہ محلہ گھوم گھوم کر چیزیں بیچنے کا رواج رہا پھر بازاروں کا سلسلہ شروع ہوا جو ہفتہ میں ایک دو یا تین دن لگتے تھے اور بڑے شہروں میں روزانہ لگتے تھے۔ اس کے بعد مستقل دوکانوں کا سلسلہ قائم ہوا۔ یہ مقامی تجارت کے طریقے تھے۔

ملک کے مختلف حصوں میں بازار لگنے کا سلسلہ شروع ہوا تو تاجروں نے ان میں جانا شروع کیا۔ اس کا آغاز اور ارتقاء دارصل حج کے دنوں میں مکہ مکرمہ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں بازاروں کے لگنے سے ہوا۔ پھر تو یہ بازار سال بھر ملک کے مختلف علاقوں میں لگنے لگے۔ وہ سال کے شروع میں ماہ محرم سے ایک مقام پر لگنے شروع ہوتے۔ پندرہ بیس دن جاری رہنے کے بعد بازار دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتا۔ پھر تیسرے مقام پر یہ سلسلہ سال بھر جاری رہتا۔ یہ بازار ترتیب وار یہ تھے: دومتہ الجندل، المشرق (ہجر میں) صحار (عمان میں) دبا (عمان

میں)، الشحر (مہرہ میں)، عدن، الراتبہ (حضرت موت میں) بحاشہ، عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز (مکہ کے قریب) منی، مزدلفہ، عرفات (دوران حج) نطاۃ (خبیر میں) حجر (سیمامہ میں)۔

رفتہ رفتہ ان بازاروں میں سے سرحدی بازاروں میں پڑوسی ملکوں کے تاجر بھی حصہ لینے لگے اور اس طرح بین الاقوامی تجارت (INTER-NATIONAL TRADE) کی بنیاد پڑی۔ اسی کے ساتھ عرب تاجروں نے بھی بین الاقوامی منڈیوں میں جانا شروع کر دیا۔ یمن وغیرہ کی جنوبی بادشاہتوں اور شمالی بادشاہتوں کے تاجروں نے کافی پہلے بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا جب کہ مرکزی وسطی عرب کے تاجروں نے پانچویں چھٹی صدی عیسویں میں اس کا آغاز کیا اور مکہ کے قریشی تاجروں نے شام عراق، ایران اور حبشہ وغیرہ سے تجارتی تعلقات قائم کر لیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد نے خاص کر اس تجارت کو فروغ دیا۔

بین الاقوامی تجارت کی دو شاہراہیں تھیں: ایک مغربی شاہراہ (WESTERN ROUT) جو مکہ کو جنوب میں یمن سے اور اس کے ذریعہ ہندوستان اور لنکا وغیرہ سے ملاتی تھی اور شمال میں شام اور اس سے اوپر کے علاقوں سے جوڑتی تھی دوسری مشرقی شاہراہ (EASTERN ROUTE) جو مغرب میں حبشہ سے شروع ہو کر مشرق میں بخد کے راستے عراق اور ایران وغیرہ پر ختم ہوتی تھی۔ اس بین الاقوامی تجارت کی اہم ترین شاہراہ مغربی تھی۔ اس تجارت سے خوشحالی آئی اور بعض برائیاں بھی۔ ان میں سودی تجارت سب سے اہم تھی۔

زراعت:

عرب کے اکثر علاقوں میں تجارت تو ممکن بھی تھی اور دستور بھی لیکن زراعت مشکل تھی کیوں کہ زرخیز علاقے اور پانی کم دستیاب تھا البتہ نخلستانوں، وادیوں، میدانوں اور پہاڑی سطح مرتفع پر کاشتکاری ہوتی تھی اور کھجور کے علاوہ متعدد پھل، سبزیاں اور اناج اگائے جاتے تھے۔ مکہ مکرمہ کے قریب طائف کے شہر اور علاقے میں اچھی خاصی زراعت ہوتی تھی۔ وہاں کھجور اور انگور کے کافی اور بڑے بڑے باغات تھے۔ ان کے علاوہ غلہ، سبزیاں اور پھل پیدا ہوتے تھے۔

مدینہ منورہ میں یہود اور عرب دونوں کے باغات تھے جن میں زیادہ تر کھجور پیدا ہوتی تھی

کچھ پھل اور سبزیاں بھی کاشت کی جاتی تھیں۔ شہر کے ارد گرد کا علاقہ ”حرہ“ زرخیز لاوا کی مٹی سے بنا ہوا تھا۔ اس لیے وہاں اناج خاص کر جوار اور جو کی خاصی پیداوار ہوتی تھی۔

خیبر، فدک، تیماء اور وادی القریٰ میں یہودیوں کے بڑے بڑے باغات تھے جن میں کافی مقدار میں سبزیاں اور پھل اگائے جاتے تھے۔ ان کے کھیتوں میں کافی مقدار میں جو بھی پیدا ہوتا تھا۔ ایک اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ صرف خیبر میں چالیس ہزار دست کھجور، پانچ ہزار صاح نوئی اور پندرہ ہزار صاح جو کی سالانہ پیداوار تھی۔ شمال مشرقی علاقہ یمامہ، جو بنو حنیفہ کے قبیلہ کا علاقہ تھا، گیہوں پیدا کرنے کا سب سے بڑا کھیت تھا۔ اسے عرب کا اناج گمر (GRAMERY) کہا جاتا تھا اور مکہ مدینہ کو زیادہ تر اسی علاقے سے گیہوں ملتا تھا۔

ان کے علاوہ بھی بعض وادیاں اور علاقے اناج وغیرہ کی پیداوار کے لیے مشہور تھے جنوبی عرب میں یمن وغیرہ میں علاقہ کے اناج کے علاوہ خوشبودار لکڑی، پھل اور سبزیاں پیدا کی جاتی تھیں۔

صنعت و حرفت:

اگرچہ دستکاری کم تھی لیکن بعض دستکاریاں مقامی ضرورت کے علاوہ برآمد کے لیے بھی کافی تھیں۔ ہر شہر، گاؤں اور دیہات میں مقامی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے چھوٹے موٹے دستکار تھے۔ ان میں لوہار، موچی، بڑھئی، اسلحہ ساز، چمڑے کے دستکار، روغن گر، شراب ساز وغیرہ شامل ہیں۔

مکہ مکرمہ میں لوہاری، شراب سازی اور بعض اور دستکاریاں مشہور تھیں۔ مدینہ منورہ کے قبیلہ بنو قبیقاع کے یہودی سناری میں شہرت رکھتے تھے اور اسلحہ سازی بھی کرتے تھے۔

طائف کی دو صنعتیں چمڑا سازی اور شراب سازی اتنی وسیع پیمانے پر ہوتی تھیں کہ ان کی پیداوار برآمد (EXPORT) بھی کی جاتی تھی۔ یہی حال ایلہ کی تلواروں کا تھا وہ پورے عرب میں مشہور و مستعمل تھیں۔ یمن میں عمدہ ریشمی اور سوتی کپڑے اور عطریات عربوں کے مختلف قبیلوں کے علاوہ باہر کے ملکوں میں بھی جاتے تھے۔

مزدوری:

عرب آبادی کا بڑا حصہ جو دولت اور دوسرے وسائل سے محروم تھا۔ اپنے ہاتھوں کی محنت کی روٹی کھاتا تھا۔ ان میں طرح طرح کے مزدور تھے۔ بہت سے لوگ گھریلو نوکروں اور خادموں کا کام کرتے تھے وہ عام طور سے غلام اور کنیر ہوتے تھے۔ آزاد مزدوری کرنے والوں میں کچھ لوگ چرواہے بن جاتے تھے۔ عربوں کی ایک دولت مویشی پالنا تھا۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدوری پر مکہ کے لوگوں کی بھیڑ بکریاں اپنے لڑکپن میں چرائی تھیں۔ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی چرواہے کا پیشہ کرتے تھے۔

دیہات و شہر کے خاندان کی اچھی عورتیں نو مولود بچوں کو اجرت پر دودھ پلاتی اور ان کو پالتی پوتی تھیں۔ حضرت حلیمہ سعدیہ نے ہمارے رسول اکرم ﷺ کو بچپن میں تقریباً دو سال دودھ پلایا تھا اور پھر مزید تین سال تک آپ کی دیکھ بھال کی تھی۔

مکہ، طائف، مدینہ اور خیبر وغیرہ کے باغات میں زرعی مزدوروں کے کام کرنے کا پتہ چلتا ہے۔ خاص کر مدینہ کے اوس و خزرج قبیلوں کے مفلس مرد، عورت اور بچے عرب اور یہودی باغات میں بطور مزدور کام کرتے تھے۔

اسی طرح بہت سے تجارتی مزدور بھی تھے جو بار برداری، جانوروں کے ہانکنے اور دوسرے کاموں کو اجرت پر کرتے تھے۔ غلاموں کو تجارت میں بھی بطور مزدور لگایا جاتا تھا۔

مزدوروں میں مرد، عورت اور بچے سبھی شامل تھے۔ عربی تاریخ میں ان کو عام طور سے عمال ایدہم (اپنے ہاتھوں سے کام کرنے والے) کہا جاتا ہے۔ ان کی مزدوری بہت معمولی ہوتی تھی اور عام طور سے ان کی ضروریات کیلئے کافی نہیں ہوتی تھی۔

سماجی زندگی:

بدو قبائل کے مقابلہ میں شہری قبیلوں کی سماجی زندگی زیادہ مہذب و متمدن تھی۔ اس میں ان کے اقتصادی نظام کی لائی ہوئی خوش حالی کو دخل تھا۔ تجارت، حرفت اور زراعت کے سبب ان کے پاس کافی دولت جمع ہو گئی تھی اور بعض بعض تو بہت دولت مند تھے۔ کئی لوگ تو سودی

کاروبار کرنے لگے تھے۔ ان میں مکہ، مدینہ اور طائف وغیرہ کے عرب اور یہودی تاجروں کے لگے ہوئے تھے۔ اس خوش حالی کے سبب ان کا معیار زندگی کافی بلند ہو گیا تھا۔

وہ کچے کچے مکانات میں رہتے تھے جو بڑے اور کشادہ ہوتے تھے۔ امیر لوگوں کے مکانات دو منزلہ تک ہوتے تھے۔ اوسط درجہ اور غریب لوگوں کے کچے اور چھوٹے۔

ان کی غذا میں دودھ، مکھن، گوشت اناج، کھجور وغیرہ شامل تھیں۔ امیر لوگ گیسوں استعمال کرتے تھے۔ جب کہ دوسرے طبقہ کے لوگ جو اور مکا وغیرہ پر گزارا کرتے تھے اسی طرح امیروں کا لباس عمدہ سوتی اور ریشمی کپڑے کا ہوتا تھا اور دوسرے لوگ موٹے کھردرے کھد ریاوئی کمبل کا بنا ہوا لباس استعمال کرتے تھے۔

ان کے گھروں میں ضرورت اور آسائش کی کافی چیزیں ہوتی تھیں۔ چارپائی یا تخت (سریر) اور گدے، تکیے، لحاف اور کمبل سونے کیلئے ہوتے تھے۔ کھانے کے کئی برتن ہوتے تھے اور پکانے کیلئے بھی۔ وہ پتھر، لکڑی اور دھات کے بنے ہوتے تھے۔ گھروں میں دروازے ہوتے تھے جن پر پردے لٹکائے جاتے تھے۔ رات میں روشنی کے لئے چراغ جلاتے تھے۔ سواری کیلئے عام جانور اونٹ تھا لیکن ان کے علاوہ خچر، گدھا اور گھوڑا بھی استعمال ہوتا تھا۔ ان کی قیمتیں زیادہ بھی ہوتی تھیں اور کم بھی۔ آمدنی کے لحاظ سے عرب سماج کے طبقات ان کا استعمال کرتے تھے۔

مشترکہ عرب روایات:

بدوی اور شہری قبیلوں میں رہن سہن کے بعض اختلافات کے باوجود ان میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں۔ ان کا قبائلی نظام یکساں تھا۔ مکہ کے علاوہ ان دونوں کا سیاسی نظام بھی ایک جیسا تھا۔ سب سے اہم ان دونوں میں وہ عرب روایات مشترک تھیں۔ جو ان کو عرب بناتی تھیں ان میں اہم ترین ان کی عربی زبان تھی جو مقامی بولیوں میں بٹی ہونے کے باوجود بطور فصیح زبان یکساں تھی اور پورے ملک میں ایک سرے سے دوسرے تک بولی جاتی تھی۔ ان میں ایک عرب نسل ہونے کا گہرا شعور تھا جو ان کو تمام لڑائی جھگڑے کے باوجود اتحاد کی لڑی میں

پروئے رکھتا تھا۔ ان کی قبائلی رسوم و روایات بھی مشترک تھیں۔

ان کے نزدیک قبائلی اتحاد سب سے اہم چیز تھی۔ فرد اپنے قبیلہ کا ہر حال میں پابند رہتا تھا اور قبیلہ کی عزت و جان کے لیے اپنی آن و زندگی قربان کر دیتا تھا۔ زندگی اور مال و آبرو کی حفاظت کیلئے قصاص اور دیت کی روایت اور قبیلہ کی اجتماعی ذمہ داری دوسری اہم سماجی قدر تھی۔ فیاضی و سخاوت اور مہمان نوازی عربوں کی ضرب المثل خصوصیت تھی۔ اس طرح بہادری اور شجاعت ان کا انفرادی اور اجتماعی وصف تھا۔ وفاداری، عہد و وعدہ کی پابندی اور سچ بولنا عربوں کی دوسری امتیازی خصوصیات تھیں۔ باہمی تعاون اور قبیلے والے کی حق اور ناحق میں فوری مدد کرنا ان کے خون میں تھا۔ ان کے معاشرے میں امانتداری بھی ایک اہم وصف تھا۔ ایسی ہی اور بعض صفات و خصوصیات تھیں جن میں تمام عرب مشترک حصہ رکھتے تھے۔

ان اقدار و صفات کے مجموعہ کو ”مرؤہ“ (اردو میں مروت) کہا جاتا تھا اور جس شخص یا قبیلہ میں یہ اقدار و صفات جتنی زیادہ پائی جاتی تھیں وہ اتنا ہی سماج میں معزز و محرم سمجھا جاتا تھا۔ مرؤہ کی مقدار ہی سرداری دلاتی تھی۔ عربوں کا شعور نیک و بد بھی زندہ تھا۔ وہ اوصاف و اقداری کی نہ صرف تعریف و توصیف کرتے بلکہ ان کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے اور اگرچہ خود اپنانے سے قاصر رہتے تو اوصاف و خصائص سے آراستہ افراد و طبقات کا احترام کرتے تھے۔

✽ مشترکہ سماجی برائیاں:

سماجی اقدار عالیہ کے پہلو بہ پہلو بدو اور متمدن عربوں دونوں میں بہت سی سماجی اور اخلاقی خرابیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ دولت کی بہتات اور غربت و جہالت کی لعنت نے ان میں ^(۱) شراب نوشی عام کر دی تھی۔ دوسری برائی جوئے اور قمار بازی کی تھی اور اس کی بہت سی قسمیں تھیں جن میں عرب مبتلا تھے۔ یہاں تک کہ وہ بسا اوقات بیوی بچوں کو جوئے میں داؤں پر لگا دیتے تھے۔

بدکاری یا زنا کاری اگرچہ ان کے سماج میں موجود تھی لیکن زیادہ عام نہ تھی اور شریف خاندان عام طور سے اس بچے ہوئے تھے۔ اسی طرح نومولود لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی لعنت بعض بعض

قبائل اور افراد تک محدود تھی اور عام طور سے ان میں بدوی قبائل مبتلا تھے۔ شہری قبائل بڑی حد تک اس سے محفوظ تھے مگر عورت کی عزت انکی سماج میں کم تھی اور اس کو حقوق نہیں ملتے تھے۔

(۵) شادی بیاہ میں یہ افراط تھی کہ ایک مرد جتنی بیویاں چاہتا کر سکتا تھا اور بے شمار باندیاں رکھ سکتا تھا۔ نکاح کے دو اور خراب پہلو بھی تھے جو زیادہ عام نہ تھے لیکن بہر حال تھے وہ یہ کہ اپنی سوتیلی ماں سے باپ کے مرنے کے بعد شادی کر لینا اور بیک وقت دو یا زیادہ سگی بہنوں کو نکاح میں جمع کر لینا۔ بعض اور محرّمات سے بھی شادی کر لینے کا رواج تھا۔ (۶)

دولت کی فراوانی اور خوف خدا کی کمی نے عربوں میں کمزور طبقات پر ظلم کرنے اور ان کی استحصال کرنے کی ریت بھی ڈال دی تھی۔ بیوہ، یتیم، بے سہارا، اجنبی اور کمزور عام طور سے ان کے ظلم و ستم کا شکار ہوتے تھے۔ کھانے پینے میں حلال و حرام کا تصور نہ تھا۔ جو کچھ جی چاہتا کھا لیتے۔ مردہ جانور، کیڑے مکوڑے، درندے وغیرہ کھا جاتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی بعض اور چھوٹی موٹی خرابیاں موجود تھیں اور دونوں عرب طبقوں میں مشترک تھیں۔

ایک اور بڑی مشترک خرابی ان کی مذہبی زندگی میں تھی۔ اگرچہ عربوں میں خاص کر متمدن قبائلی میں اللہ تعالیٰ کا تصور موجود تھا اور دین ابراہیمی کی بعض تعلیمات جیسے روزہ، نماز اور حج کا دھندلا تصور اور ان پر عمل بھی کسی حد تک باقی تھا لیکن عام طور سے ان کی مذہبی زندگی غیر اللہ کی عبادت پر مبنی تھی۔

عربوں میں سب سے زیادہ بت پرستی کا رواج تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قبیلہ خزاعہ کے اک سردار عمرو بن لُحی نے صدیوں پہلے مکہ میں سب سے پہلے بت پرستی کو عام کیا جو وہ اپنے سفر شام کے دوران سیکھ کر آیا تھا۔ اس نے خانہ کعبہ میں ایک بت لا کر رکھ دیا۔ بعد میں وہاں ہردن کے لئے ایک بت یعنی تین سو ساٹھ بت رکھ دیئے گئے۔ ان میں ہبل سب سے بڑا تھا اور کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔ قریش مکہ نے اس بت پرستی کو مزید رواج اور مکہ سے تمام عرب میں بت پرستی حاجیوں اور زائرین کے ذریعہ پھیل گئی۔ پھر تو ہر قبیلہ کا الگ الگ بت بن گیا۔ مدینہ کا عرب قبیلے اوس بخرج منات کو پوجتے تھے۔ طائف کے ثقیف وغیرہ کا قومی بت لات تھا جو نخلہ کے مقام پر نصب تھا۔ غطفان قبیلے کا سب سے بڑا بت غری تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت

سے بت تھے۔

بت پرستی کے سوا وہ سور، چاند، ستاروں کی پوجا یعنی مظاہر پرستی میں بھی مبتلا تھا۔ ان کے مذہبی ادہام میں فرشتوں کا عقیدہ تو تھا مگر وہ ان کو اللہ کی بیٹیاں تصور کرتے تھے اور ان دیوی دیوتاؤں اور خداؤں کو وہ اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یعنی وہ ان کی الوہیت مطلقہ کے پوری طرح قائل نہ تھے۔

دین ابراہیمی کے باقیات اور یہودی اور عیسائی طبقات سے تعلق کی وجہ سے وہ رسالت کے عقیدے سے بھی واقف تھے مگر یہ تصور ناقص تھا۔ معاد و آخرت کا تصور ان کے یہاں بالکل ختم ہو چکا تھا۔ ان میں سے بعض قبیلوں میں دہریت والحاد بھی پایا جاتا تھا کہ اسی زمانے کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔

دین ابراہیم کے باقیات میں ان کے ہاں نماز، روزہ اور حج کا تصور موجود تھا اور عمل بھی اگرچہ وہ خام تھا۔ وہ دوپہر کی نماز ادا کرتے تھے اگرچہ اس کی صورت مسخ کر دی تھی۔ قرش کے ہاں عاشوراء کے روزہ کا بھی رواج تھا۔ زکوٰۃ کا کوئی تصور نہ تھا لیکن خیرات و سخاوت کو اس کی جگہ دیتے تھے حج کے مقدار ارکان ان کے ہاں قائم تھے لیکن ان میں عربوں نے کافی ادہام داخل کر دیئے تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا پیرو کہنے اور سمجھنے کا شعور رکھتے تھے۔

مکہ اور قریش کا خاص مقام

جنوبی عرب میں شہروں، قصبوں اور متمدن مرکزوں کا ارتقاء کئی صدیوں پہلے ہوا اسی طرح شمال کی بادشاہتوں کے زمانے میں ان کے کئی شہر بڑے ترقی یافتہ تھے مگر مرکزی اور وسطی عرب میں آباد کاری کافی دیر سے شروع ہوئی۔ مکہ مکرمہ میں اللہ کا گھر..... کعبہ..... روز ازل سے موجود تھا اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں اس کی تعمیر نو ہونے کے بعد ہر زمانے میں اس کی عمارت موجود رہی مگر مکہ مدتوں شہر نہیں بن سکا۔ کعبہ کے پہلے متولی اور نگہبان اور مکہ کے پہلے ہاسی بنو جرہم تھے جن سے حضرت اسماعیل نے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر کے ایک مستقل آبادی کی شکل دے دی تھی۔ کعبہ کے ساتھ ساتھ چاہ عزم کا بھی اس میں بڑا حصہ تھا کہ پانی زندگی کی جان تھا مگر اس کے بعد بھی مدتوں تک مکہ خیموں ہی کا شہر رہا بستی نہ بن سکا۔

مکہ شہر کی تعمیر:

مکہ مکرمہ کو شہر بنانے اور باقاعدہ مکانات تعمیر کرنے کا سہرا قریش کے ایک سردار قصی بن کلاب کو جاتا ہے۔ وہ پانچویں صدی عیسوی کے اوائل میں گذرے ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تیسویں یا چالیسویں نسل میں اس قبیلہ کے جد امجد عدنان ہوئے اور ان کی دسویں نسل میں فہر ہوئے جن کا خاندان بنو فہر کہلایا اور پھر وہ قریش کے نام سے موسوم ہوا۔ قریش کے معنی پر اختلاف ہے۔ علماء نے اس کے پندرہ معنی بتائے ہیں جن میں سب سے مشہور ہے۔ اتحاد و جمع کرنے والا۔ بعض لوگوں نے سب کو کھا جانے والا غالب رہنے والا بھی بتائیں ہیں۔ قریش کا پہلا لقب فہر کو یا ان کے دادا نضر کو ملا تھا ان کی آٹھویں نسل میں قصی بن کلاب ہوئے۔

مکہ اور قریش:

قصی بن کلاب بڑے اوصاف کے مالک اور فطری قائد تھے۔ انہوں نے قریش کے تمام خانوادوں اور خاندانوں کو متحد کیا، اور اپنے وسیع اثرات کے تحت ان کو کعبہ کے ارد گرد مکانوں میں بسایا۔ کچھ قریشی خانوادے اور خاندان کعبہ کے بالکل پڑوس میں بسائے گئے۔ ان کا مجموعی نام ”قریش البطائح“ پڑا۔ ان میں قصی کے خاندان کے علاوہ بنو تیم، بنو مخزوم، بنو عدی بنو جح اور بنو سہم وغیرہ اہم تھے۔ کچھ قریشی خاندانوں کو کعبہ کے اندرونی حلقہ کے باہر ذرا فاصلہ پر بسایا گیا۔ ان کا امتیازی نام ”قریش الظواہر“ رکھا گیا۔ ان میں بنو لوی اور بنو فہر وغیرہ تھے۔ ان کی سکونت درہائش سے ان کے سماجی مقام اور قبائلی وقار کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

مکہ کی تاریخ:

مقدس شہر مکہ مکرمہ کی مختصر سیاسی تاریخ یہ ہے کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کا خاندان ان کی سسرال..... بنو جرہم..... کے ساتھ مکہ کے اقتدار پر قابض رہا۔ بعد میں بنو خزاعہ اور بنو بکر نے مکہ کی سیاست پر قبضہ کر لیا اور کعبہ کی تولیت وغیرہ سمیت کئی مناصب پر قبضہ کر لیا۔ بنو صوفہ کے پاس صرف ایک عہدہ..... اجازہ..... رہ گیا۔ خزاعہ کے پاس حجابہ اسدانہ، سقایہ، رفادہ اور قیادہ کے اہم مناصب چلے گئے۔ اور وہ سچ مچ مکہ کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔

قریش کے خاندان کے پاس کوئی طاقت و قوت نہ تھی اگرچہ وہ حضرت اسمعیل و حضرت ابراہیم علیہما السلام کے اصلی جانشین تھے۔ قصی بن کلاب مکہ سے دور شامی سرحد کے قریب اپنے ننہالی قبیلہ بنو عذرہ میں پلے بڑھے اور جوان ہو کر اپنے آبائی وطن مکہ پہنچے انہوں نے پہلے خزاعی سردار حلیل حبشہ کی بیٹی جہی سے شادی کر کے مکی سیاست میں اثر و رسوخ حاصل کیا پھر اپنے ماموؤں کے خاندان بنو عذرہ کی مدد سے مکہ کی سیاست و اقتدار کو پوری طرح سے حاصل کر کے بنو خزاعہ کو نکال باہر کیا اور قریش کے خاندانوں کی حکومت قائم کر دی۔

مکہ کی سیاست:

اس میں شک نہیں کہ قصی بن کلاب مکہ مکرمہ کے سب سے بڑے اور بااثر سردار تھے لیکن وہ بادشاہ یا مالک کل نہ تھے۔ وہ مکہ کی سیاست دوسرے سرداروں کے تعاون و اشتراک سے چلاتے تھے۔ ان کے پاس کل پانچ مناصب تھے جن میں ایک کا اضافہ انہوں نے خود کیا۔ انہوں نے مشورہ اور ملاقات کے لئے ایک عمارت بنائی جس کا نام ”دارالندوہ“ رکھا۔ شہر قبیلہ اور ملک کے معاملات پر تمام اہم سرداروں پر منصب داروں سے صلاح و مشورہ اسی مجلس میں سب کے اتفاق سے کیا جاتا تھا۔ اس گھر کا انتظام بھی انہیں کے پاس تھا۔

باقی عہدوں میں سفارہ اور منافرہ بنو عدی کے پاس تھا۔ قبہ اور اعنہ بنو مخزوم کے پاس تھا، دیت و مغارم بنو تیم، ازلام و ایسار بنو جح اور اموال بنو سہم کے پاس تھے۔ اسی طرح مکہ میں دراصل اشرافیہ حکومت (OLIGARCHY) یعنی قریش کے اشراف کی حکومت قائم تھی جن میں بہر حال قصی کو امتیاز و شرف حاصل تھا اور وہ مکہ مکرمہ اور قریش کے سب سے بڑے سردار تھے۔

قریشی مناصب:

مکہ کی سیاسی حکومت اور قبائلی نظام میں یہ عہدے ہر خاندان میں اسی طرح ہر ایک خاندان کے سرداروں کے پاس منتقل ہوتے رہے۔ زیادہ مشہور روایت کے مطابق قصی بن کلاب نے اپنی موت کے وقت اپنے پانچوں عہدے اپنے بیٹے عبدالدار کو دے دیئے تھے اور پانچ بیٹوں کو محروم کر دیا تھا۔ بعد میں قصی کے دوسرے بیٹے عبد مناف کے فرزندوں نے عبدالدار کے بیٹوں سے لڑ کر دو عہدے حاصل کئے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

مکہ کی تاریخ کے منصف ازرقی کا بیان زیادہ صحیح ہے کہ قصی نے اپنے چھ عہدوں میں سے تین عبدالدار کو دیئے تھے اور تین عبد مناف کو باقی بیٹے چھوٹے یا نا اہل تھے۔ اس لیے ان کو کچھ نہیں دیا۔ عبدالدار کو حجابہ اسدانہ، لواء اور دارالندوہ دیئے جب کہ عبد مناف کو سقایہ، رقادہ اور قیادہ۔ پھر یہ عہدے قصی کے ان دونوں فرزندوں کے خاندانوں میں چلتے رہے جیسے کہ دوسرے چلتے رہے تھے۔

عبد مناف نے اپنی موت کے وقت سقایہ اور رقادہ اپنے چھوٹے بیٹے ہاشم کو دیئے اور قیادہ اہم عہدہ بڑے بیٹے عبد شمس کو۔ عبد شمس نے اپنے بیٹے امیہ کو اپنا جانشین بنایا۔ اور امیہ کے بعد ان کا بڑا لڑکا حرب قیادہ کا منصب دار بنا اور حرب سے وہ ان کے بڑے فرزند ابوسفیان کو منتقل ہوا جو عہد نبوی کے معاصر قیادہ کے عہدہ دار تھے۔

دوسری طرف رقادہ اور سقایہ کے عہدوں کی منتقلی اتنی سیدھی نہیں رہی تھی ہاشم کے انتقال کے وقت ان کے تمام فرزند چھوٹے تھے۔ اس لیے سقایہ ان کے بھائی مطلب کو ملا اور رقادہ دوسرے بھائی نوفل کو، پھر رقادہ پہلے تو نوفل ہی کے خاندان میں رہا پھر وہ اور ندوہ دونوں بنو اسد کے حکیم بن حزام نے خرید لیئے۔

سقایہ مطلب سے ان کے بھتیجے اور ہاشم کے فرزند عبدالمطلب کو ملا اور ان کے بعد ان کے بڑے فرزند زبیر کو ملا۔ زبیر کے بعد ان کے بھائی ابوطالب کو اور انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی عباس کے حوالہ کر دیا۔ پھر وہ انہی کے خاندان میں چلتا رہا۔ عہد نبوی میں ان عہدوں، ان کے عہدیداروں اور ان کے خاندانوں کی جدول یہ ہے۔

نمبر شمار	منصب	منصب دار	منصب دار کا خاندان	منصب کا مفہوم
1	حجابہ اسدانہ	عثمان بن طلحہ	بنو عبدالدار	کعبہ کی تولیت، کلید کعبہ ان کے پاس رہتی تھی
2	دارالندوہ	حکیم بن خزام	بنو عبدالدار بنو اسد	قومی مجلس دارالندوہ کی تولیت
3	لواء	عامر بن ہاشم	بنو عبدالدار	جنگ و امن میں قریشی پرچم اٹھانے اور رکھنے کے عہدہ دار

4	رفادہ	حارث بن عامر احکیم بن حزام	بنو نفل بنو اسد	کعبہ کے حاجیوں اور زائروں کے لئے کھانے کا انتظام کرنا
5	سقاہ	عباس بن عبد المطلب	بنو ہاشم	حاجیوں اور زائروں کیلئے پانی کا انتظام کرنا۔
6	مشورہ	یزید بن ربیعہ الاسود	بنو اسد	قومی مشورہ کا انتظام اور مجلس کی صدرات
7	دیت ومغارم	ابوبکر صدیق بن ابوقحافہ	بنو تیم	قصاص و دیت اور جرمانوں کا فیصلہ کرنا
8	قیادہ	ابوسفیان بن حرب	بنو امیہ	جنگ و امن میں قریشی افواج کے قائد و کمان دار
9	قبہ الاعنہ	ولید بن مغیرہ / خالد بن ولید	بنو مخزومی	جنگ میں شہسوار فوج کی قیادت اور خیموں وغیرہ کا انتظام
10	سفارۃ ومنافرہ	عمر بن خطاب	بنو عدی	قبیلوں سے معاملات طے کرنا اور سفارت کاری
11	ازلام والیسار	صفوان بن امیہ	بنو جحج	فال کے تیروں کے متولی اور فال نکالنے کے نگران
12	اموال	حارث بن قیس	بنو سہم	کعبہ میں بتوں کے چڑھاوے کے مال کی حفاظت و تولیت

مکی سیاست کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ صرف عہدے دار ہی کاروبار حکومت و انتظام
نہیں چلاتے تھے بلکہ متعدد دوسرے سردار بھی اثر انداز ہوتے تھے بلکہ سچ یہ ہے کہ عہدے تو

نسبتاً نوجوانوں کو دیے جاتے تھے اور بزرگ اور اقتدار کے اصل مالک سرداران سے بلند ہوتے تھے۔ عہد نبوی کے قریب جن قریشی سرداروں کا سکھ چلتا تھا اور جن کے مشورہ اور فیصلہ کے بغیر کوئی اہم قومی یا قبائلی کام نہیں انجام پاسکتا تھا۔ ان میں اہم ترین سردار تھے۔

زبیر بن عبدالمطلب، ابوطالب بن عبدالمطلب، ابولہب بن عبدالمطلب (بنو ہاشم) عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ (بنو عبد شمس) ابواحیمہ، سعید ابن العاص، عقبہ بن ابی معیط اور ابوسفیان بن حرب (بنو امیہ) ولید بن مغیرہ اور حکیم بن ہشام ابو جہل (بنو مخزوم) عبد اللہ بن جدعان (بنو تیم) العاص بن وائل (بنو سہم) حکیم بن حزام، العاص بن ہاشم ابوالبحتری (بنو اسد) امیہ بن خلف اور ابی بن خلف (بنو جحج) اخنس بن شریق ثقفی، عاص بن وائل اور حارث بن قیس (بنو سہم)، اسود بن عبد یغوث (زہرہ) اور سہیل بن عمرو (بنو عامر بن لوی) وغریہ اور دوسرے شیوخ۔ دراصل تمام سرداروں کی مشترکہ حکومت مکہ میں قائم تھی۔ ان میں سے بعض سردار اپنے اوصاف و خصوصیات کی بنا پر نمایاں و موثر مقام حاصل کر لیتے تھے اور یہی اشرافیہ تھی۔

اقتصادی حالت اور تجارت:

مکہ مکرمہ کی اقتصادی حالت زیادہ تر تجارت پر مبنی تھی۔ وہاں کچھ دستکاریاں اور مزدوری پر مبنی پیشے بھی تھے لیکن اقتصادی خوش حالی کا دار و مدار تجارت پر تھا۔ یہ تجارت مقامی بھی تھی جس میں پھیری والے۔ دکاندار اور مختلف شہری بازار حصے دار تھے۔ ملک گیر بھی تھی کہ ملک کے مختلف اطراف سے طرح طرح کے تاجر آتے اور مکہ والوں کے لئے سامان ضرورت لاتے تھے جب کہ مکی تاجر عرب کے مختلف حصوں میں جاتے اور ان کے بازاروں میں خرید و فروخت کرتے تھے۔ شہر کے تمام بڑے اور حوصلہ مند تاجر بین الاقوامی تجارت میں بھی حصہ لیتے تھے۔

موسم گرما میں شام اور سردی کے موسم میں ہمن کے تجارتی سفر کرتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ ایلاف کی آیت نمبر 2 میں رحلتہ الشتاء والصیف (سردی اور گرمی کے سفر) کے نام سے آیا ہے۔ وہ بعض اور ممالک سے بھی تجارت کرتے تھے۔ ان میں حبشہ، عراق ایران اور مصر وغیرہ شامل تھے۔

مکی تجارت کو فروغ دینے میں دو چیزوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ اول خانہ کعبہ کی موجودگی جس کی زیارت و حج کے لیے سال بھر زائرین کا تانتا لگا رہتا تھا، دوم مکہ دونوں بین الاقوامی تجارتی شاہراہوں..... مغربی و مشرقی..... کے سنگم پر واقع تھا۔ بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے میں اور لوگوں کے علاوہ بنو عبد مناف یعنی عبد شمس، ہاشم، نوفل اور عبد المطلب نے بڑا حصہ لیا اور بالترتیب حبشہ، شام ایران اور یمن کے ملکوں سے تجارتی تعلقات مستحکم کئے اور ان کی حکومتوں سے قریشی تاجروں کے لئے مراعات حاصل کیں۔

مکی تجارت دو طرح سے کی جاتی تھی۔ عام طور سے تاجر اپنا مال لے کر خود بازاروں میں جاتے تھے اور خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ دوسرا طریقہ شراکت یا اجارہ کا تھا جس میں مالدار تاجر اپنا مال کسی حوصلہ مند اور باصلاحیت تاجر کو دے کر بھیجتے تھے اور نفع میں دونوں شریک ہوتے تھے۔ نفع میں شراکت معاہدہ پر مبنی تھی۔ بہت سے بے مال تاجر سود پر مال دار تاجروں سے سامان یا رقم قرض لیتے تھے۔ اس کی وجہ سے سودی کاروبار کو مکہ میں بہت ترقی ملی۔

☆ (سودی کاروبار کرنے والوں میں عاص بن وائل سہمی، ولید بن مغیرہ مخزومی، عبد المطلب بن ہاشم ہاشمی، عباس بن عبد المطلب ہاشمی، عثمان بن عفان اموی وغیرہ کے نام آتے ہیں) دولت کی ریل پیل کی وجہ سے بڑے تاجروں اور قابل اعتماد لوگوں کے گھر بینک بھی بن گئے تھے۔ جہاں لوگ اپنا مال واسباب حفاظت کیلئے رکھتے تھے۔ اموی خاندان کے ایک سردار عمرو بن امیہ اسی سبب سے الامین کہلاتے تھے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل الامین کا خطاب مل چکا تھا۔

مکی تجارت میں ہر چھوٹا بڑا شریک تھا۔ جو نہیں جاسکتا تھا وہ اپنا مال دوسرے تاجر کو دے دیتا تھا۔ اس میں معمولی دستکار اور عورتیں بھی حصہ لیتی تھیں۔ مکہ کے بڑے تاجر گھرانے اسی تجارت کے سبب بہت مال دار ہو گئے تھے۔ خوش حالی اور مال کے ساتھ ان میں کئی خرابیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ جیسے غرور، اکڑ، غریبوں سے نفرت و حقارت، عیش پسندی وغیرہ۔

قریش کی زرعی جائدادیں:

مکہ مکرمہ میں تو زراعت نہیں ہوتی تھی لیکن مکہ کے قریب طائف کی وادی میں ہوتی تھی۔ دولت کے آنے کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ مکہ کے بڑے بڑے تاجروں نے اس وادی میں بڑے چھوٹے باغات لگائے جن میں کھجور انگور وغیرہ جیسے پھل پیدا ہوتے تھے۔ شہد کے چھتے لگائے جاتے تھے اور بعض اور زرعی کاروبار کیے جاتے تھے۔ ان زرعی جائیدادوں سے ان کو بہت آمدنی ہوتی تھی۔

جن کی تاجروں کی اس وادی اور طائف میں ایسی جائیدادیں تھیں، ان میں ولید بن مغیرہ مخزومی، عاص بن وائل سہمی، عتبہ بن ربیعہ اور اس کا بھائی شبیبہ، ابوسفیان بن حرب اموی، عثمان بن عفان اموی اور عبدالمطلب ہاشمی اور ان کے بعض فرزند بہت ممتاز تھے۔ ایک اموی سردار ابواجمہ سعید بن عاص کے کئی باغات اور جائیدادیں تھیں اور وہ مکہ کے مالدار ترین اور معزز ترین سردار گنے جاتے تھے۔

فوجی طاقت:

دولت کے ساتھ ساتھ مکہ کے قریش پورے عرب میں خاص کر وسطی علاقے میں سب سے بڑی فوجی طاقت بھی تھے۔ ان کی اور ان کے حلیفوں کی افواج سب سے بڑی، تعداد میں زیادہ، اسلحہ سے لیس، تجربہ کار اور ماہر فن تھیں۔ ان کا مقابل کوئی نہ تھا اور گزشتہ پانچ سو سال سے وہ کسی سے نہ ہارے تھے۔ ان کی کوئی باقاعدہ ایسی فوج نہ تھی جیسی آج کل ہوتی ہے بلکہ قبیلہ کے تمام جنگ کے قابل مرد فوجی خدمت انجام دیتے تھے اور جنگ کے وقت سب نکل کھڑے ہوتے تھے۔

بدو قبیلوں میں عرب کا طریقہ جنگ الْکُوْر وَالْفُوْر (حملہ کرنا اور پلٹ جانا اور پھر حملہ کرنا) تھا۔ وہ باقاعدہ جم کر نہیں لڑتے تھے لیکن شہری اور خاص کر قریشی قبیلوں نے منظم جنگ کا طریقہ تَعْبِیْۃ (صف بنا کر جنگ لڑنے کا طریقہ) (PITCHED BATTLE) ایرانیوں سے سیکھ لیا تھا۔ ان کی فوجی پانچ حصوں میں منقسم ہوتی تھی: مقدمہ (VANGUARD) قلب (CENTRE)، میمنہ (RIGHT WING)، میسرہ (LEFT WING) اور موخرہ

اساتہ (REAR GUARD) اسی بنا پر اس کو انجیس (پانچ بازوؤں والی) کہا جاتا تھا۔
 ہر بازو پر علم بردار (لواء والے افسر) ہوتے تھے اور ان کے کمانڈر بھی۔ زیادہ تر فوج
 پیدل (INFANTRY) ہوتی تھی لیکن کچھ حصہ شہسوار (CAVBRY) بھی ہوتا تھا۔
 ایک دستہ تیراندازوں کا خاص ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ تلوار، ڈھال، نیزہ، خنجر اور تیروکمان
 ہر سپاہی کے پاس ہوتے تھے پوری فوج کا ایک مرکزی قائد ہوتا تھا جو فوج کو لڑاتا تھا۔ اور سب
 افسر اس کے ماتحت ہوتے تھے۔

قریشی اوصاف:

قریش کی اصل طاقت اس بنا پر تھی کہ وہ شہر الہی کے باسی اور کعبہ کے متولی تھے۔ اس لئے
 پورے عرب میں ان کا احترام و تقدس قائم تھا۔ وہ گرچہ بت پرست اور مظاہر پرست تھے۔ تاہم
 ان میں دین ابراہیمی کا کچھ حصہ باقی تھا۔ حج کرانے کے باعث ان کی دھاک پورے عرب پر
 بیٹھی تھی۔ پھر ان کی دولت و تجارت اور فوجی طاقت نے ان کو مزید طاقت و قاربخش دیا تھا۔
 قریش کے دواہم اوصاف تھے: ایک ان کا باہمی اتحاد و تعاون، دوسرے ان کا علم و غنم۔
 وہ خاندانی اور انفرادی جھگڑوں کے باوجود متحد رہتے تھے۔ خاص کر دشمن کے آگے۔ ان میں تنظیم
 و محبت بہت تھی اور ان کا دل بھی بہت بڑا تھا۔ وہ درگزر سے کام لیتے تھے اور خطرات سے بچتے
 تھے مگر بہادر بھی تھے اور موقع آجاتا تو جان پر کھیل جاتے۔ ان کے انہیں اوصاف کی بنا پر پورا
 عرب ان کا احترام کرتا تھا اور انہی کے سبب ان میں آخری نبی ﷺ پیدا ہوئے۔

جاہلی تمدن

جاہلی دور میں اگرچہ بعد کے مہذب ادوار جیسا تمدن نہ تھا لیکن ان کا اپنا ایک تمدن ضرور تھا جس کو ہم جاہلی تمدن کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں علوم و فنون کی کوئی ترقی نہیں ہو سکی اور اس کا ایک سبب ہی تھا کہ اسلام سے قبل لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ مکہ جیسے عظیم شہر میں اسلام سے قبل صرف سترہ آدمیوں کے پڑھے لکھے ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ خاص کر لکھا جانے والے کم تھے۔ (اس لیے اس دور میں علوم و فنون میں کوئی خاص ترقی نہیں ہو سکی لیکن ایسا نہ تھا کہ کوئی علم و فن تھا ہی نہیں۔ م فن تعمیر:

جاہلی دور کا سب سے مضبوط و مستحکم تمدنی ارتقاء فن تعمیر کے میدان میں ہوا۔ خاص کر جنوبی عرب اور شمالی عرب کی سلطنتوں کے عہد میں۔ اس میں سب سے عظیم کارنامہ توسعہ مآرب (مآرب کا بند) تھا جو اپنی وسعت کے سبب آج بھی اپنے کھنڈرات کی شکل میں انجینئرنگ کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سلطنت سبا کی عمارتیں تھیں۔ ان سے زیادہ شمالی عرب کی عمارتیں خاص کر بھٹی سلطنت کی عمارتیں آج بھی اپنی پرانی عظمت کے نشان ہیں۔ بعض دوسرے علاقوں کی عمارتیں بھی ان کے فن تعمیر کا نمونہ تھیں۔ خاص کر خانہ کعبہ۔

سنگتراشی اور مصوری:

متمدن علاقوں خاص کر جنوب و شمال کی سلطنتوں میں سنگتراشی اور مصوری کے دو فنون نے بھی کافی ترقی کی تھی جب کہ مرکزی وسطی عرب میں یہ دونوں ابتدائی حالت میں تھے، وہ اپنی

عمارتوں کو مجسموں اور بتوں سے سجاتے تھے۔ ان میں افسانوں اور جانوروں دونوں کے مجسمے ہوتے تھے۔ خانہ کعبہ میں رکھے گئے بتوں میں سے اساف و نائلہ کے دو بت ایک مرد عورت کے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے دوسرے بت بھی تراشے ہوئے تھے۔ جیسے ہبل وغیرہ۔ متمدن عربوں نے پتھر کی سلوں اور ستونوں پر کتبات کا فن بھی کسی حد تک سیکھ لیا تھا۔

مصوری کا فن بھی زیادہ تر عمارتوں یا کپڑوں سے وابستہ تھا۔ خانہ کعبہ کی دیواروں پر قدیم انبیاء کی تصویریں جو سب کی سب خیالی تھیں۔ بنائی گئی تھیں۔ سلطنت سبا، حمیر، معین اور نہطیوں نے بھی پانے محلوں کو تصاویر سے سجانے کا فن سیکھ لیا تھا جو خاص ترقی یافتہ تھا۔ بعض دوسری عمارتی تصویروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

مصوری کا ایک اور ذریعہ کپڑوں کی صنعت ہے۔ کپڑے بنانے والے استعمال کے کپڑوں کو خاص کر پردوں کو تصویروں سے سجاتے تھے۔ یہ تصویریں..... مردوں اور عورتوں کے علاوہ جانوروں کی بھی ہوتی تھیں۔

دوسرے علوم و فنون:

جاہلی عرب زندگی گزارنے کے لئے بعض دوسری معلومات بھی رکھتے تھے مگر ان کو علوم و فنون کا درجہ دینا مشکل ہے۔ مثلاً وہ زمین کی ساخت، پانی ملنے کے مقامات، مٹی کی قسموں بادلوں اور ہواؤں کو پہچان لیتے تھے۔ ستاروں اور چاند سورج کے اثرات سے بھی کسی قدر واقف تھے۔ پہاڑوں اور نخلستانوں کو جانتے تھے اور صحرا کے تو پر دروہ ہی تھے لیکن یہ جغرافیہ کا علم نہ تھا۔ البتہ اس کا شعور ضرور تھا۔

اسی طرح وہ اپنے آباء و اجداد کے بارے میں بھی کافی معلومات رکھتے تھے۔ خاص طور سے نسب کو محفوظ رکھتے تھے۔ ان کا علم نسب اگرچہ زبانی تھا تاہم کافی ترقی یافتہ تھا۔ ہر قبیلہ میں اس کے ماہرین پائے جاتے تھے جو ”نسب“ کہلاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر، حضرت عقیل اور حماد الراویۃ حالی عہد میں بھی ماہرین نسب سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تاریخی شعور بہت محدود اور غیر ترقی یافتہ تھا۔ لیکن وہ روایات، قصہ کہانیوں اور بعض واقعات کے ذریعہ اس کا اچھا شعور رکھتے

تھے۔ اس شعور کی ترقی میں ان کی جنگوں کا خاصا تھا کیوں کہ وہ قبائلی جنگوں (ایام العرب) کو خوب یاد رکھتے تھے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عہد جاہلیت میں ان معلومات کو علوم و فنون نہیں کہا جاسکتا ان کا اگر کوئی علم تھا تو وہ تھی عربی شاعری اور عربی زبان۔

عربی زبان و ادب:

بدو اور متمدن دونوں قسم کے عرب طبقات نے اپنی عربی زبان کو خوب ترقی دی تھی۔ اس جاہلی ادب کی عمارت چار چیزوں پر کھڑی تھی یعنی زبان دانی، امثال، قصص اور شاعری۔ عربی زبان پورے جزیرہ نمائے عرب میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ البتہ اس کی دو قسمیں تھیں۔ ایک مقامی بولی جو ہر علاقے میں الگ الگ تھی اور ایک علاقہ کی بولی دوسرے علاقہ میں مشکل سے سمجھی جاتی یا بالکل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ البتہ فصیح عربی زبان جو لکھی جاتی تھی، وہ ہر گوشہ اور ہر قبیلہ میں سمجھی جاتی تھی اگرچہ قبیلوں میں کافی اختلاف تھا۔ خاص کر شمالی اور جنوبی قبیلوں میں۔ لیکن یہ اختلاف فہم کی راہ میں حائل نہیں ہوتا تھا سب سے زیادہ صحیح اور فصیح و بلیغ عربی حجاز و نجد کی تھی اور ان میں سے بھی قریش اور ہوازن کے قبیلہ کی زبان نکسالی سمجھی جاتی تھی۔

عربی نثر:

بولی جانے والی زبان عربی کے برعکس لکھی جانے والی عربی زبان یعنی نثر نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کے فن کی کمی کے سبب عربی نثر کو محفوظ نہیں رکھا جاسکا اور عربی ادب زبانی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی نثر کے جاہلی نمونے بہت کم ملتے ہیں۔ نثری نمونے زیادہ تر عرب خطیبوں کے تقریری ٹکڑوں پر مشتمل ہیں۔ ہر قبیلہ میں یوں تو کئی کئی خطیب ہوتے تھے۔ لیکن ہر قبیلہ کا ایک قومی خطیب بھی ہوتا تھا۔ قس بن ساعدہ کو عظیم جاہلی خطیب سمجھا جاتا ہے۔ سوید بن صامت، زبرقان بن بدر، تمیمی عمر بن معد یکرب زبیدی اور اکثم بن صلیح تمیمی، حاحب بن زرارہ تمیمی وغیرہ دوسرے اہم قبائلی خطیب تھے۔

حکمت و دانائی کی باتوں پر مبنی اور مجمع سے بھرپور بعض کاہنوں کے جملے اور فقرے بھی ملتے

ہیں جو عربی نثر کے ابتدائی نمونے ہیں۔ اسی طرح بعض واقعات اور قصوں پر مشتمل عبارتیں عربی ادب کا حصہ ہیں ان میں سب سے اہم امثال ہیں جو مختصر الفاظ میں بہت زیادہ معانی کی ترسیل کرتے ہیں۔ ضرب الامثال اور کہات کے لحاظ سے عربی نثر کافی مالدار ہے کہ اس کا بہت بڑا ذخیرہ عربی زبان میں موجود ہے۔

قصص (قصوں) کا تعلق زیادہ تر عربوں کی جنگوں (ایام العرب) سے ہے۔ ان کا اصل حصہ تو منظوم ہوتا تھا لیکن ابتدائی حصہ نثر پر مشتمل ہوتا تھا جو اہم واقعات اور قصوں کو محفوظ رکھتا تھا۔ ان میں بکرو تغلب کی طویل جنگوں، غمراء اور وحس اور بعاث و فجار کی جنگوں کے قصے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض وصایا (وصیتیں) بھی نثر کے عمدہ نمونے سمجھے گئے۔ جیسے زہیر بن جناب اور ذوالاصغ العدوانی کو وصیتیں۔

عربی شاعری:

بدوی اور جاہلی تہذیب کی اصل دین عربی شاعری ہے۔ صدیوں تک وہ ترقی کرتی رہی اور پانچویں چھٹی صدی عیسویں میں عروج پر پہنچ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جاہلی شاعری کو جو فنی عظمت اور بلندی ملی وہ بعد میں کسی بھی دور کی شاعری کو نصیب نہ ہو سکی۔ اس کا سب سے اہم سبب تو ان کا شاعری سے بے پناہ لگاؤ تھا اور قدرت و فطرت سے ان کی بیکراں قربت۔ ہر انسانی تہذیب کی طرح عربی تہذیب میں بھی شاعری نے نثر سے پہلے ترقی کی اور ان کے قبائلی شعراء نے خون جگر صرف کر کے اس کو ترقی اور عروج کی معراج سے ہم کنار کیا۔ عکاظ وغیرہ کے سالانہ جلسوں اور قبائلی رقابتوں نے بھی اس کو مزید جلا بخشی۔ میلوں اور بازاروں میں شعرو شاعری کے جو مقابلے ہوتے تھے۔ ان کے سبب ہر قبیلہ و علاقہ نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو اس کی خدمت میں لگا دیا۔

عربوں کے ہر قبیلہ کا ایک قومی یا قبائلی شاعر ہوتا تھا بلکہ ہر خاندان و قبیلہ میں معتدداہم شعراء ہوتے تھے اور ان میں سے بہترین قومی شاعر کا اعزاز و مقام حاصل کرتا تھا۔ اس طرح جتنے قبیلے تھے اتنے ہی قبائلی شعراء مکران میں سے سات شاعروں کو ان کے بے مثال قیصدوں

کے سبب سب سے عظیم شاعر قرار دیا گیا۔ ان کے قصیدے اہم شعراء اور ناقدین کے متفقہ فیصلے کے بعد بہترین تعلقات، کہا جاتا ہے۔ یہ سات شعراء حسب ذیل ہیں:

۱۔ نابذہ ذبیانی (۶۰۴ء) اصل نام زیاد بن معاویہ تھا اور قبیلہ غطفان کے خاندان ذبیان کا فرد تھا۔ وہ نجی سلطنت کے حکمران نعمان بن منذر کا درباری تھا۔
 ۲۔ عثرہ بن شداد عجمی (۶۱۵ء) قبیلہ عبس کا تھا اور عظیم شاعر تھا۔ اس کا اصل قبیلہ بھی غطفان تھا۔

۳۔ طرفہ بن البعد (۵۵۲-۵۵۴ء) کا تعلق قبیلہ بنو بکر کے خاندان بنو ضبیعہ سے تھا اور یمامہ و بحرین کا باشندہ تھا اور بنی شاعر تھا۔

۴۔ مراؤ القیس (۵۳۹ء) کندہ کی سلطنت کے آخری بادشاہ حجر کا فرزند تھا شراب و کباب اور آزاد زندگی کا رسیا عظیم شاعر تھا۔ اصل نام ابوالحارث خندج بن حجر کندي تھا۔
 ۵۔ عمرو بن کلثوم (۵۲۴ ق ۵۷۰ء) قبیلہ تغلب بنو جشم کا شاعر تھا۔ اس کو ایک سو پچاس سال کی عمر ملی تھی۔

۶۔ حارث بن حلزہ (۵۵۲/۶۰۱-۵۴۰ء) بنو بکر کے قبیلہ اور خاندان بنو لشکر کا فرد تھا عمرو بن کلثوم کا معاصر بھی تھا۔

۷۔ زہر بن ابی سلمیٰ ربیعہ بن رباح حزنی (۶۰۹ء ۲۳ ق ھ) باپ کی طرف سے قبیلہ حزینہ کا اور ماں کی طرف سے غطفان / ذبیان کا فرد تھا۔ زیادہ پرورش ماں نے کی۔
 بعض ماہرین نے درید بن الصممہ، مرثش الاکبر اور امیہ بن ابی الصلت کو بھی تعلقات والے شعراء میں شمار کیا ہے۔

عربی شعر کے بعض ماہرین نے سات عظیم شعراء میں بعض دوسرے شعراء کو بھی شامل کیا ہے۔ بہر حال وہ سات عظیم ترین شعراء ہوں یا نہ ہوں، وہ عظیم شعراء میں ضرور تھے اور تھے: علقمہ بن عبیدہ، الأشی میمون اور لبید بن ربیعہ۔

۸۔ علقمہ میمون بن عبیدہ حمیری (ادائل ساتویں صدی عیسوی میں) قبیلہ بنو تمیم کا عظیم

شاعر تھا اور یمامہ کا باشندہ۔ اسلام کے عروج کے بعد فوت ہوا۔

۹۔ الاعشی میمون بن بیش (م ۶۲۹ھ) یمامہ کا باشندہ تھا اور نجران کے حکمران

خاندان بنو عبد المنان سے وابستہ رہا تھا۔ بعد میں مشرف بہ اسلام ہوا۔

۱۰۔ لبید بن ربیعہ (م ۲۲۰ھ - ۵۲۰ء) بنو عامر بن صعصعہ کے قبیلے کے تھے۔ نعمان

بن منذر سے بھی وابستہ رہے۔ بعد میں اسلام لائے اور شاعری ترک کر دی وہ عظیم صحابی رسول بھی تھے اور کوفہ میں وفات پائی۔ انہوں نے ایک عظیم نعتیہ قصیدہ بھی کہا ہے۔

ان عظیم و نمایاں ترین شعراء کے علاوہ بھی متعدد اہم شعراء تھے۔ ایسے تیرہ شعراء معالیک

کہلاتے تھے کہ وہ خانماں برباد شعراء تھے جو اپنے خاندان اور قبیلہ سے کٹ گئے تھے ان میں

الغضریٰ (م ۵۱۰ء) تابع ثراء (چھٹی صدی عیسوی) اور عبید بن عبد الغریٰ اور سلیم بن المسک

کافی اہم سمجھے جاتے تھے۔ دراصل عرب شعراء کو سات طبقات میں تقسیم کیا گیا۔ ۱۔ اصحاب

المعلقات، ۲۔ اصحاب الجہرات، ۳۔ اصحاب المنقیات، ۴۔ اصحاب المذہبات، ۵۔ اصحاب المراثی،

۶۔ اصحاب المشوہات، ۷۔ اصحاب الکلمات۔ اصحاب الجہرات کے چھ شاعر بہت اہم تھے:

۱۔ عبید اللہ بن ربیعہ، ۲۔ بشر بن ابی حازم، ۳۔ امیہ بن ابی الصلت (م ۶۳۱ھ) ۴۔ عدی

بن زید بن حماد، ۵۔ خدش بن زہیر اور ۶۔ النمر بن قلوب۔

اصحاب المنقیات میں المقرش الاکبر (اصل نام عمرو بن سعد بن مالک) اور علقمہ النحل

اہم شاعر مانے جاتے ہیں۔

باقی طبقات کا ذکر اختصار کے سبب نہیں کیا جا رہا ہے۔

جن شعراء جاہلی نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا دور پایا ان کو المخضرم المخفض مون کہا

جاتا ہے۔ جیسے حضرت لبید بن ربیعہ عامری، اشی میمون یمامی، حسان بن ثابت خزرجی

(۵۴ھ - ۶۶ق ھ) وغیرہ۔

متعدد جاہلی شعراء نے مختلف اصناف سخن میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ غزل میں الصممہ بن

عبد اللہ قشیری اور الحسین بن مطر اسدی، فخر و حماسہ میں المقرش الاکبر، عمرو بن کلثوم اور غترہ بن

شداد عسسی، مدح میں زہیر بن ابی سلمیٰ اور الاعشی، ہجو میں قریط بن انیف، معذرت میں نابغہ ذبیانی،

مرثیہ میں قس بن ساعدہ، وصف (سراپا / منظر کشی) میں امرؤ القیس، حکمت و فلسفہ میں زہیر بن ابی سلمیٰ وغیرہ معروف تھے۔

عربی شاعری صرف جذبات اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ وہ ایک سماجی قدر اور تہذیبی طاقت تھی۔ عربوں کی زندگی پر شاعری کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ جنگ و امن کا ذریعہ تھا۔ قبائلی شاعر اپنی شاعری سے جنگیں برپا کر دیتے تھے اور پھر اسی ذریعہ سے وہ امن بھی قائم کرتے تھے۔ صلح و ربط میں اور تعلق استوار کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا اس کی مختلف اصناف میں فخر و حماسہ، قصیدہ، غزل، مرثیہ، نظم، حمد، مدح، معذرت اور ہجو تھیں لیکن سب سے اہم قصیدہ تھا جو سب سے زیادہ موثر تھا۔ وہ اتنی اہم سماجی طاقت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے دفاع اور تبلیغ کے لیے بھی اس کو تسلیم کیا تھا۔ بقول ایک جدید مفکر، عربی شاعری عربوں کے ضمیر کی آواز اور اس کی محافظ تھی۔

عہد نبوی کی حیات طیبہ کا اولین دور

ہمارے رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو دو بڑے زمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک مکی دور جو ۵۷ء سے شروع ہو کر ۶۲۲ء پر ختم ہوتا ہے۔ یہ پورا دور لگ بھگ تریپن سال کا ہے۔ دوسرا مدنی دور جس کا زمانہ ۶۲۲ء سے ۱۱ھ ۶۳۲ء پر محیط ہے۔ یہ دونوں ادوار وقت، واقعات اور انقلابات غرضیکہ ہر لحاظ سے مختلف ہیں۔

پھر مکی دور کو بھی دو بڑے زمانوں میں تقسیم کرتے ہیں: پہلا جو ۵۷ء سے ۶۱ء تک چالیس سال پر مشتمل ہے۔ یہ زمانہ بعثت یا نبوت سے پہلے کا ہے اور دوسرا ۶۱ء سے ۶۲۲ء تک تقریباً تیرہ سال کا زمانہ آپ ﷺ کی نبوت کا دور ہے۔ اس لیے اس کو نبوی سنہ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

ان دونوں مکی ادوار میں فرق یہ ہے کہ بعثت سے پہلے کے دور میں آپ ایک شریف و صالح نوجوان، امین تاجر اور عظیم شخص کی حیثیت سے ابھرتے ہیں جب کہ بعد نبوت کے تیرہ سال دور میں آپ اللہ کے رسول آخریں کی حیثیت سے تمام انسانوں کو اللہ کی طرف بلا تے، دین اسلام پھیلاتے اور انسانوں کی دنیا و آخرت سنوار نظر آتے ہیں۔

خاندان رسالت:

اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے تمام نبیوں اور رسولوں کو انتہائی شریف و اعلیٰ خاندان میں پیدا فرماتا ہے کہ تا کہ وہ ان کی نبوت و رسالت پر ایک گواہی بن جائے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان قریش کے خاندانوں میں سب سے ممتاز تھا۔ آپ کی ایک حدیث ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے مجھ کو حضرت ابراہیم کی نسل اسمعیل میں پیدا کیا پھر ان میں بنو کنانہ میں چنا۔ ان میں سے منتخب ترین قبیلہ قریش میں بھیجا، پھر بنو عبد مناف میں اور پھر ان کے بہترین خاندان بنو ہاشم میں پیدا کیا اور بنو ہاشم میں مجھ کو منتخب فرمایا۔

مکہ مکرمہ کے باب میں ذکر آچکا ہے کہ آپ کے والد ماجد کا نام عبد اللہ، دادا کا عبد المطلب، پردادا کا ہاشم تھا۔ ہاشم عبد مناف کے دوسرے فرزند تھے اور عبد مناف کے والد قصی بن کلاب مکہ شہر کے اصل بانی اور قبیلہ قریش کے سب سے بڑے مورث تھے آپ کی والدہ ماجدہ کا نام بی بی آمنہ تھا جو قریشی خانوادے بنو زہرہ کے ایک شیخ اور معزز سید وہب بن عبد مناف کی بیٹی تھیں۔

خاندانی رقابت:

عرب قبائلی روایات کے مطابق اور خاص کر قریشی اتحاد و یگانگت کے نتیجہ میں قریش کے تمام خانوادوں اور خاندانوں میں محبت و الفت کے تعلقات تھے۔ کچھ تو اس بنا پر کہ وہ سب خون کے قریبی رشتہ دار تھے اور کچھ اس سبب سے کہ وہ ایک ساتھ رہتے بستے تھے اور ان کی زندگی اتحاد و یگانگت کے بغیر ناممکن تھی۔ تاہم ان میں آپس میں اختلاف لڑائی جھگڑے اور ٹکدر بھی پیدا ہو جاتا تھا جو عارضی ہوتا تھا اور جلد دور ہو جاتا تھا۔ یہ اختلافات قبائلی رقابت پر مبنی نہیں ہوتا تھا البتہ بعض خاندانوں میں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ تعلق خاطر ہوتا تھا۔

خاندان بنو عبد مناف:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل خانوادہ بنو عبد مناف تھا جس میں چار بڑے گھرانے تھے: بنو عبد شمس، بنو ہاشم، بنو مطلب اور بنو نوفل۔ حالات و واقعات نے اور بنو عبد المطلب کو ایک دوسرے کے ساتھ اور بنو شمس اور بنو نوفل کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب کر دیا۔ یہ اندرونی تعلق تھا ورنہ ان چاروں خاندانوں میں دوستی، تعاون، شادی بیاہ کے تعلقات اور تجارت روابط وغیرہ پوری طرح موجود تھے اور دوسرے خاندانوں کے بالمقابل یہ چاروں خاندان صرف ایک متحدہ خاندان..... بنو عبد مناف..... بن کر رہتے تھے۔

آپ کے چچا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گیارہ چچا تھے۔ ان میں سے پانچ سے آپ ﷺ کے خاص تعلقات تھے اور ان کا بھی آپ کی زندگی سے قریبی تعلق رہا۔ ان کے نام ہیں زبیر، ابوطالب، الولہب، عباس اور حمزہ۔ ان سب کی اپنی اولادیں تھیں جن میں سے کچھ آپ کے چچا ابولہب سمیت آپ پر جان چھڑکتے تھے۔ زبیر اور ابوطالب آپ سے عمر میں بہت بڑے تھے جب کہ عباس و حمزہ صرف چار اور دو سال بڑے تھے۔

زبیر کے چار فرزندوں طاہر، حجل، قرہ اور عبد اللہ میں موخر الذکر صحابی تھے۔ ان کی کئی بیٹیاں بھی مسلمان ہوئیں جیسے ضباعہ صفیہ، ام الحکم اور ام الزبیر۔ ان سب کی اولادیں بعد میں بھی چلیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ان چچا زاد بہنوں کی پرورش کی تھی۔

ابوطالب کے چار فرزند طالب، عقیل، جعفر اور علی تھے اور دود و خترام ہانی اور جمانہ تھیں۔ ان میں سے طالب آپ کے ہم عمر تھے۔

عباس کے فرزندوں میں فضل، قثم، عبد اللہ، عبید اللہ اور معبد مشہور تھے۔ باقی فرزند بعد میں پیدا ہوئے۔ ان کی کئی بیٹیاں بھی تھیں جیسے ام الفضل، آمنہ اور صفیہ۔

حمزہ کی صرف ایک بیٹی حضرت امامہ تھیں جب کہ ابولہب کے تین فرزند عتبہ، معتبہ اور عتیبہ تھے۔ موخر الذکر کو شیر کھا گیا تھا۔ باقی اسلام لائے۔

بعض دوسرے چچاؤں کی اولادیں بھی مسلمان ہوئیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق رہیں۔ جیسے حارث بن عبد المطلب کے فرزند نوفل اور سفیان وغیرہ۔ موخر الذکر تو آپ کے دودھ شریک بھائی بھی تھے۔ دراصل پورا خاندان بنو عبد المطلب آپ کو چاہتا تھا۔

آپ کی پھوپھیاں:

آپ کی چھ پھوپھیاں اور ان کے خاندان والے بھی آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپ کی پھوپھیاں کے نام ہیں۔ ام الحکیم بیضاء، برہ، عاتکہ، اردی، صفیہ اور امیمہ۔ ان کی شادیاں قریش اور ان کے بعض حلیف قبیلوں کے افراد سے ہوئی تھیں۔

مثلاً الحکیم بیضاء کی شادی خاندان بنو شمس کے ایک ممتاز فرد کریز بن ربیعہ سے ہوئی تھی اور ان سے ایک دختر اروئی بنت کریز تھیں جو حضرت عثمان بن عفان کی ماں تھیں۔ ان کی دو اور بیٹیاں تھیں۔ عاتکہ کی شادی ابوامیہ بن المغیرہ مخزومی سے ہوئی تھی۔ ان دونوں کی اولاد ام المومنین حضرات ام سلمہ ابی امیہ کے بھائی بہن تھے۔ برہ بنت عبدالمطلب ہاشمی عبدالاسد بن ہلال مخزومی کی بیوی اور مشہور صحابی ابوسلمہ بن عبدالاسد کی ماں تھیں۔ امیمہ بنوامیہ کے حلیف جحش بن رتاب کی اہلیہ تھیں۔ اروئی عمر بن وہب کی اور حضرت صفیہ عوام بن خویلد اسدی کی اہلیہ تھیں۔ موخر الذکر کے فرزند حضرت زبیر مشہور صحابی تھے۔

ولادت باسعادت:

حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی حضر آمنہ سے اپنی شادی کے چھ ماہ بعد تجارت کے لیے ملک شام گئے۔ واپس میں بیمار ہو گئے تو مدینہ منورہ میں اپنے ماموؤں عبدالمطلب کو ان کی بیماری کی خبر ان کے رفقاء سفر سے ملی تو ان کو لانے کے لیے اپنے دوسرے بڑے فرزند زبیر کو مدینہ بھیجا۔ مگر عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ ان کی تدفین کر کے ان کا سامان تجارت اور مال مکہ مکرمہ لائے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے والد مرحوم کے مال و زر اور مکان و مویشی کے وارث بنے۔ اگرچہ متمول نہ تھے تاہم فقیر بھی نہ تھے۔ آپ ددھیال اور بھیل دونوں خاندانوں کی طرف سے کافی خوشحال اور معزز تھے۔

عبداللہ کے انتقال کے دو ماہ بعد دو شنبہ ۱۲ ربیع الاول عام الفیل (جس سنہ میں ابرہہ حبشی نے مکہ پر حمل کیا تھا) مطابق ۱۱/۲۰ اپریل ۵۷۰ء ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اپنے والد مرحوم کے گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دو نام رکھے گئے احمد اور محمد۔ پہلے نام کا ذکر قرآن مجید کی سورہ صف ۲ میں ہے اور دوسرے نام کا ذکر چار سورتوں..... آل عمران ۱۴۴، احزاب ۴۰، محمد ۲ اور فتح ۲۹..... میں ہے۔ پہلا نام آپ کی ماں بی بی آمنہ نے ایک بشارت سن کر رکھا تھا اور دوسرا نام آپ کے دادا عبدالمطلب نے جو اپنے یتیم پوتے کو ہر تعریف و خوبی کے لائق جانتے تھے، رکھا۔ یہ نام ساتویں دن رکھے گئے جب آپ کا عقیقہ ہوا آپ نے ایک حدیث میں فرمایا

میں محمد بھی ہوں اور احمد بھی۔

رضاعت

پیدائش کے بعد آپؐ کی والدہ ماجدہ نے آپؐ کو دودھ پلایا۔ آپؐ کے چچا ابولہب کو آپؐ کی پیدائش پر اتنی خوشی ہوئی کہ پہلے اپنی ایک باندی ثوبیہ (ثَوْبَةُ) کو آپؐ کے دودھ پلانے پر مامور کیا پھر اس کو اسی خوشی میں آزاد کر دیا۔ عربوں میں یہ پرانی روایات تھی کہ شریف خاندانوں کے بچوں کے لیے دودھ پلانے والی رکھی جاتی تھیں۔ ثوبیہ نے اس سے پہلے آپؐ کے چچا حضرت حمزہ کو بھی دودھ پلایا تھا جو اتفاق سے آپؐ کی خالہ اور والدہ چچا زاد بہن ہالہ بنت وہب زہری کے فرزند تھے اور آپؐ کے خالہ زاد بھائی ہونے کے علاوہ رضاعی بھائی تھے۔ عرب دستور کے مطابق آپؐ کو کچھ دنوں بعد قبیلہ بنو سعد بن بکر اہوازن کی ایک لڑکی حضرت حلیمہ سعدیہ دودھ پلانے اور دیہات کی کھلی اور صاف ہوا میں پرورش کرنے کیلئے اپنے علاقہ لے گئیں۔ جہاں آپؐ پہلے دو سال تک رہے۔ اس مدت کے بعد آپؐ کا دودھ چھڑا دیا گیا۔ دادا اور ماں وغیرہ نے بی بی حلیمہ کی خدمات کا اچھا معاوضہ دیا۔

بچپن:

دودھ چھڑانے کے بعد بی بی حلیمہ آپؐ کو واپس مکہ مکرمہ آپؐ کی والدہ ماجدہ کے پاس لائیں لیکن ان دنوں مکہ میں بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ شفیق ماں نے اپنے یتیم بچے کی صحت کی خاطر پھر بی بی حلیمہ کے ساتھ ان کے قبیلہ ہوازن کے علاقہ میں واپس بھیج دیا۔ وہاں آپؐ نے اپنی عمر شریف کے تین اور سال گزارے۔ یعنی ۵ء سے ۸ء تک اس علاقہ میں رہے جہاں کی عربی زبان سب سے زیادہ فصیح و بلیغ سمجھی جاتی تھی۔ آپؐ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں قریش کی بہترین زبان کے ساتھ ساتھ بنو سعد کی فصیح ترین عربی بولتا ہوں۔

بی بی حلیمہ کے گھر آپؐ اپنے رضاعی بھائیوں اور بہنوں..... عبداللہ، شیماء (حذافہ اصلی نام)، ایسہ اور حذیفہ..... کے ساتھ بچپن کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ ایک بار حضرت شیماء نے آپؐ کو گد گدایا تو آپؐ نے تنگ آ کر ان کے کاندھے پر کاٹ لیا جس کا نشان محبت رہ

گیا۔ یہاں چار پانچ سال کی عمر میں پہلا شق صدر کا معجزہ پیش آیا۔ دو فرشتوں نے آپؐ کا سینہ مبارک چارک کر کے قلب مبارک کو دھویا اور پھر سینہ سل دیا۔ یہ واقعہ دیکھ کر آپؐ کی رضاعی ماں حلیمہ اور رضاعی باپ حضرت حارث ابن عبدالغریٰ پریشان ہو گئے اور آپؐ کو آپؐ کی والدہ ماجدہ کے پاس مکہ مکرمہ پہنچا گئے۔ آپؐ کے رضاعی والدین اور بھی بہن آپؐ سے بہت محبت کرتے تھے اور آپؐ کو بھی ان سے بے پناہ محبت تھی جو تا عمر قائم رہی۔

ماں کی گود میں:

بنو سعد کے علاقہ اور رضاعی والدین کے گھر سے آنے کے بعد صرف ایک سال (۶۷-۶۸ء) تک ہی آپؐ اپنی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ کی محبت و شفقت سے بہرہ یاب ہو سکے۔ اپریل ۶۷ء کے بعد کسی وقت جب آپؐ کی عمر شریف چھ سال کی تھی آپؐ کی والدہ ماجدہ نے مدینہ منورہ میں اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کرنے، اپنے مرحوم شوہر کی قبر کی زیارت کرنے اور اپنے یتیم بچے کو سیر کرانے کے لئے اپنی خادمہ حضرت اُمّ ایمن کے ساتھ سفر کیا۔ مدینہ منورہ میں جو اس وقت یثرت کہلاتا تھا، آپؐ نے ایک ماہ تک اپنی والدہ کے ساتھ قیام کیا۔ وہاں آپؐ مدنی بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے جن میں امیہ نامی ایک لڑکی بھی تھی۔ جس مکان میں آپؐ ٹھہرے تھے اسی کے قریب آپؐ کے والد مرحوم کی قبر بھی تھی۔ آپؐ کو اپنے اس مدنی قیام کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں اور ان کا ذکر آپؐ بعد کی زندگی میں اکثر کیا کرتے تھے۔

مدینہ منورہ میں ایک ماہ کے قیام کے بعد غالباً مئی۔ جون ۶۷ء میں آپؐ کی والدہ آپؐ کو ساتھ لے کر ام ایمن وغیرہ کی معیت میں مکہ کیلئے واپس ہوئیں تو مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر واقع گاؤں ابواء میں بیمار ہوئیں اور کچھ دنوں بعد انتقال کر گئیں اور وہیں مدفون ہوئیں۔ مدینہ منورہ کے رشتہ داروں نے حضرت ام ایمن کے ساتھ آپؐ کو شفیق دادا کے پاس مکہ مکرمہ پہنچا دیا۔

دادا کے سایہ شفقت میں:

آپؐ کے دادا عبدالمطلب بن ہاشم قریش کے بزرگ ترین سرداروں میں ممتاز تھے اور بنو ہاشم کے عظیم ترین شیخ تھے۔ انہوں نے کم شدہ چاہ زمزم کو دوبارہ رکھ دیا تھا جس سے ان کی توقیر میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ وہ مالدار تاجر اور صاحب ثروت شخص تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ غریب پرور، بیکسوں کے والی، غریبوں اور یتیموں کے ہمدرد اور نہایت فیاض و نخی تھے۔ ان کے اجلال و اکرام کا یہ عالم تھا کہ خانہ کعبہ کے ارد گرد مسجد حرم کے صحن میں جن قریشی سرداروں کی مندیں لگتی تھیں ان عبدالمطلب کی مسند بہت ممتاز تھی اور ان کے اکرام میں کوئی شخص حتیٰ کہ ان کے محبوب فرزند بھی اس پر نہیں بیٹھتے تھے۔

اسی سالہ بوڑھے دادا کو اپنے یتیم پوتے سے بہت زیادہ محبت تھی۔ کچھ تو اس بنا پر کہ وہ ان کے چہیتے مرحوم فرزند کا بیٹا تھا، کچھ اس کی یتیمی کے سبب اور زیادہ تر ہونہار بچے کی صفات و اٹھان کی وجہ سے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت ساتھ رکھتے۔ اپنی گود میں بٹھا کر کھلاتے اور اپنی مسند پر بٹھاتے، آپؐ کے چچا منع بھی کرتے تو شفیق دادا ان کو روک دیتا۔ آپؐ کو بھی اپنے دادا سے بہت پیار تھا۔ آپؐ ان کی خدمت کرتے، ان کے کھوئے ہوئے اونٹ ڈھونڈ لاتے اور اپنی عمر کے مطابق دوسری خدمات انجام دیتے۔

مگر اللہ تعالیٰ کو دادا کے سایہ شفقت کو آپؐ کے سر پر زیادہ دنوں رکھنا منظور نہ تھا۔ اس لیے بیاسی سال کی عمر میں عبدالمطلب نے ۹۵ھ انتقال کیا۔ ان کا جنازہ اٹھا تو آپؐ اس کے پیچھے روتے جاتے تھے۔ عبدالمطلب مکہ کے مشہور قبرستان جو حجون نامی مقام پر تھا دفن ہوئے آپؐ کو اپنے شفیق دادا کی محبت و شفقت آٹھ سال تک حاصل رہی۔ ان میں سے دو سال تک آپؐ ان کی براہ راست پرورش میں رہے۔

چچاؤں کی نگرانی میں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو حقیقی یا سگے چچا زبیر اور ابوطالب تھے کہ دونوں کی ماں آپؐ کے والد مرحوم عبد اللہ کی بھی ماں تھیں۔ باقی چچا اگرچہ دوسری ماؤں سے تھے تاہم ان سو تیلانہ قطعی نہ تھا۔ وہ سب آپؐ کے جاں نثار تھے۔ دادا کے بعد آپؐ کی اصل تربیت و پرورش

انہیں دونوں سکے چچاؤں نے کی۔ زبیر بن عبدالمطلب کو آپ سے بہت محبت تھی۔ وہ اکثر آپ کو جھولا جھلاتے، آپ کو لوری سناتے اور طرح طرح سے دیکھ بھال کرتے۔ ان کے بیٹے بیٹیاں، جو آپ کے چچا زاد بھائی بہن تھے۔ آپ کا ہر طرح خیال رکھتے۔ دوسرے سکے چچا ابوطالب اپنی مالی کمزوری کے باوجود آپ کی ہر شرط خبر گیری کرتے، اکثر ساتھ رکھتے، اور اپنے ساتھ کھلاتے، پلاتے اور سلاتے۔ آپ کی چچی حضرت فاطمہ بنت اسد ہاشمی آپ کے لئے کھانا بچا بچا کر رکھتیں اور اپنے بچوں طالب وغیرہ سے زیادہ آپ کا خیال کرتیں۔ آپ کی پھوپھیوں نے بھی اس زمانہ میں آپ کی ہر طرح دیکھ بھال کی۔ سچ یہ ہے کہ پورا خاندان آپ پر جان چھڑکتا تھا۔

زبیر اور ابوطالب کی مشترکہ کفالت کے عرصہ میں جو تقریباً بارہ چودہ سال (۵۷۹ء تا ۵۹۲ء) تک جاری رہا، آپ کا بچپن گذرا اور لڑکپن آیا۔ اس زمانے کے کئی واقعات دلچسپ بھی ہیں اور اہم بھی۔ ان کا آپ کی آئندہ زندگی پر خاصا اثر پڑا۔

تعمیر کعبہ میں شرک:

ایک واقعہ کا تعلق خانہ کعبہ کی پہلی قریشی تعمیر نو سے ہے۔ مکہ مکرمہ کے چاروں طرف پہاڑی سلسلہ ہے اور خانہ کعبہ ان کی وادی یا تلہٹی میں واقع ہے۔ اس لیے بارش کے ریلے سے اس کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ قریش نے اس کی مرمت کی تو مکہ کے تمام لوگوں نے اس مقدس کام میں حصہ لیا۔ اپنے ہر عمر لڑکوں کے ساتھ آپ نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اپنے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب کے ساتھ جو آپ سے صرف چار سال بڑے تھے، آپ اپنے مبارک کاندھے پر پتھر لالا کر کاریگروں کو دیتے تھے۔ پتھروں کی رگڑ سے تکلیف ہوتی تھی لہذا حضرت عباس نے مشورہ دیا کہ اپنا تہمن (ازار) کھول کر کاندھے پر رکھ لیں تاکہ پتھر کی رگڑ سے محفوظ رہیں۔ آپ نے اپنا تہمد کھولنا ہی چاہا تھا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو برہنہ ہونے سے بچا لیا۔ یہ سنت الہی ہے کہ وہ اپنے رسولوں اور پیغمبروں کو نبوت و رسالت

کے زمانے سے پہلے بھی ہر طرح محفوظ و مامون رکھتا ہے تاکہ ان کی عصمت و طہارت ان کی نبوت کی دلیل بن سکے۔

بکریاں چرانا:

اپنے لڑکپن میں آپؐ نے اپنے چچاؤں اور گھر والوں کی بکریوں کے ساتھ ساتھ دوسرے مکہ والوں کی بکریاں بھی اجرت پر چرائیں آپؐ کو ایک بکری یا بھیڑ کی چرائی کے لیے ایک قیراط (سب سے چھوٹا سکہ) ملا کرتا تھا۔ ایک حدیث نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام نبیوں نے اپنے بچپن میں بکریاں ضرور چرائی ہیں۔ یہ دراصل نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام نبیوں نے اپنے بچپن میں بکریاں ضرور چرائی ہیں۔ یہ دراصل قوم کی گلہ بانی کی الٰہی تربیت تھی۔ اور دیناوی اعتبار سے محنت کی روزی روٹی حاصل کرنے کی تعلیم بھی۔ قریش کے معزز گھرانے کے تمام لڑے بالے اپنے گھر کی بکریاں چراتے تھے جب کہ ضرور تمنداجرت پر چراتے تھے۔

بکریاں چرانے سے آپؐ کو بہت فائدے ہوئے۔ اول یہ کہ مکہ کی پہاڑیوں اور جھاڑیوں سے آپؐ کو واقفیت ہوئی۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ سیاہ جھربیریاں زیادہ مزے دار ہوتی تھیں۔ آپؐ نے بعد میں اصحاب کو اپنے لڑکپن کے اس تجربہ سے آگاہ کیا تھا۔

بکریاں چرانے کے زمانے میں آپؐ نے دوبارہ مکہ کی طرف سے موسیقی کی آوازیں سنیں۔ ساتھیوں سے اس کا سبب پوچھنے پر معلوم ہوا کہ شادی بیاہ کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ آپؐ دونوں بار جانا پاہا مگر راستے میں سستانے کے لئے بیٹھے تو نیند آگئی اور آپؐ دونوں بار ان میں شریک نہ ہو سکے۔ یہ حفاظت الٰہی تھی جو آپؐ کو لہو و لعب سے بچانا چاہتی تھی۔

تجارت سفروں میں شرکت:

عرب تاجروں کا دستور تھا کہ وہ تجارتی سفر میں اپنے لڑکوں اور نو جوانوں کو ساتھ لے جایا کرتے تھے جیسا کہ آج بھی تاجر پیشہ طبقہ کا طریقہ ہے تاکہ ان کو تجارت کے امور و روزموز سے آگاہی ہو۔ آپؐ کا سن مبارک بارہ سال ہی کا ہوا تھا کہ ۵۸۲ھ کے آغاز میں ابوطالب نے بصری (شام) کے لیے تجارتی سفر کیا اور آپؐ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اسی سفر سے آپؐ کو

راستوں، تجارتی سرگرمیوں اور لوگوں کو جاننے کا موقع ملا۔

اسی سفر کے دوران بھری کے ایک عیسائی راہب بھیرا کے آپ سے ملاقات کر اور آپ کی نبوت کی بشارت دینے کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ مگر وہ صحیح نہیں معلوم؛ اس قصہ کا تعلق دراصل ان روایتوں سے ہے جو آپ کی رسالت سے قبل آپ کے نبی بنے پیش گوئی ہیں۔ محققین علماء نے ان کو تسلیم نہیں کیا ہے۔

دوسرا تجارتی سفر آپ نے اپنے بڑے چچا زبیر بن عبدالمطلب کے ساتھ لگ بھگ سال کی عمر ۵۸ھ کے وسط یا اواخر میں یمن کا کیا۔ اس طرح قریش کے دونوں اہم ترین شاہراہوں سے آپ کا لڑکپن ہی میں تعارف ہو گیا۔

کردار نبوی:

نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو آپ اپنی قوم کی معاشرت، اقتصادی زندگی اور مذہب وغیرہ سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کی معمولی چیز، حفاظت فرمائی تھی اسی طرح آپ کو بڑے گناہوں سے بھی محفوظ رکھا۔ آپ انتہائی صالح نوجوان تھے۔ بچپن سے آپ کو بتوں سے سخت نفرت تھی اس لیے آپ نے کبھی پوجا نہیں کی۔ نہ ان کا چڑھاؤ اٹھایا اور نہ دوسری بری مذہبی اور سماجی رسموں میں حصہ کعبہ کا طواف و عمرہ اور حج چوں کہ دین بزرگوں کی عزت و خدمت، عزیزوں رشتہ دار محبت اور سب کے ساتھ الفت و یگانگت آپ کا شعار تھا۔ اس لیے آپ سب کی آنکھوں سے تھے اور لوگوں کو آپ سے بڑے کاموں کی امید تھی۔

سیرت نبوی کے مآخذ کے مجموعی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں آپ روایات کے مطابق فن شہسواری سیکھا۔ اس میں آپ اتنے ماہر ہو گئے تھے کہ زین گھوڑے پر سواری کر سکتے تھے۔ فن حرب کے مختلف گراں اور جنگ جوئی کے متعدد طریقہ عرصہ میں سیکھے۔ ان میں تلوار چلانا، تیر چلانا، نیزہ اور حربہ پھینکنا، خود وزرہ کا صحیح استعمال کئی چیزیں شامل تھیں۔ کشتی لڑنا عربی شاعرت اور فن عرب کا حصہ تھا اس لیے اسے بھی

ایسے ہی کسی مقابلے کے دوران آپؐ نے ابو جہل مخزومی کو شکست دی تھی اور آپؐ کے حربہ کے زخم کا نشان اس کی ایک ٹانگ پر رہ گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح آپؐ کی روحانی اور جسمانی دونوں طرح تربیت کی تھی۔ آپؐ کی ایک حدیث ہے کہ قوی مومن کمزور مومن سے بہتر ہوتا ہے کیوں کہ اس کی طاقت اسلام کے کام آسکتی ہے اور کسی ایمان والے کی کمزوری سے نقصان پہنچا سکتی ہے۔

جنگ فجار میں شرکت:

مدنوں سے قریش و کنانہ کے اتحاد اور قیس عیلان کے اتحاد کے درمیان ایک قتل اور معاہدے کی خلاف ورزی کے سبب جنگ ہوتی چلی آرہی تھی۔ اس کا ایک سلسلہ سا قائم ہو گیا تھا وہ رک رک کر ہوتی رہتی تھی اور کوئی فیصلہ نہ معرکہ برپا ہوا۔ پہلا معرکہ چوں کہ مقدس و حرام ماہ میں ہوا تھا اس لیے اس کا نام فجار (گناہ یا پامالی تقدس) کی جنگ پڑ گیا تھا۔

آخری معرکہ میں جو تین دن جاری رہا آپؐ نے اپنے چچاؤں اور خاندان والوں کے ساتھ باقاعدہ حصہ لیا کیوں کہ قریش حق پر تھے۔ قریشی افواج کے سپہ سالار قوی فائدہ حرب بن امیہ اموی تھے جب کہ ہر خاندان کا لشکر اس کے اپنے خاندانی کماندار کی ماتحتی میں تھا بنو ہاشم کے فوجی قائد آپؐ کے حقیقی چچا اور مربی زبیر بن عبدالمطلب ہاشمی تھے۔ آپؐ بھی ان کی فوج میں شامل تھے اور چچاؤں کو تیر اندازی کے لئے تیراٹھاٹھا کر دیتے تھے۔ یہی کام آپؐ کے سپرد تھا جسے آپؐ نے پوری تندہی سے انجام دیا۔ اس جنگ میں قریشی اتحاد کو مکمل فتح ہوئی اور دشمن نے ہار مان کر قصاص ادا کر کے جان چھڑائی اور جنگ فجار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ جنگ کی عملی تربیت کا یہ پہلا سبق جو آپؐ نے سیکھا۔

جنگ فجار کے بعد ہی آپؐ کے بڑے چچا اور مربی زبیر بن عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا اور آپؐ ابوطالب کی کفالت خاص میں آ گئے۔ اگرچہ دوسرے چچاؤں پھوپھوں اور دوسرے خاندانی بزرگوں کا سایہ شفقت آپؐ کے سر پر برابر قائم رہا۔

مکی حیات طیبہ کا دوسرا دور

مکہ کی عوامی زندگی میں شرکت:

آپؐ سن رشد کو پہنچ چکے اور بیس سال کی عمر ہو گئی تو آپؐ نے دوسرے صالح عرب نوجوانوں کا مانند مکہ مکرمہ کی عوامی زندگی، سماجی کاموں اور اقتصادی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ اس کا پہلا مظاہرہ تو حرب فجار میں آپؐ کی شرکت سے ہوا لیکن وہ ہنگامی اور جنگی صورت تھی۔ امن و امان کی مستقل صورت حال میں آپؐ نے پہلے قریشی تجارت میں حصہ لیا کہ کسب معاش کا وہ شریف ترین مشغل تھا۔ اس کے دوسرے سماجی کاموں میں بھی آپؐ نے بھرپور حصہ لیا اور مکی زندگی میں اپنے لیے نمایاں مقام بنالیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر اچھے کام کے آپؐ فطری طور سے حامی و معاون تھے اور ہر برے کام کے مخالف و دشمن۔

تجارت میں حصہ:

عرب دستور کے مطابق آپؐ نے تجارت کو اپنا وسیلہ رزق بنالیا۔ ایک صالح ہونہار اور معزز نوجوان کی حیثیت سے آپؐ پہلے ہی مکہ مکرمہ کے تجارتی حلقوں میں معروف تھے کہ تمام قریشی اور غیر قریشی یا تو آپؐ کے عزیز و اقارب تھے یا واقف کار۔ لڑکپن میں آپؐ کے چچا زبیر اور ابو طالب نے اپنے کئی تجارتی سفروں میں آپؐ کو اپنے ساتھ لے جا کر مزید روشناس کرا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے سفر شام کے بعد ابو طالب آپؐ کو اور بھی تجارتی کاروانوں میں ساتھ لے گئے تھے۔

آپؐ کے دونوں سگے چچاؤں زبیر اور ابوطالب نے آپؐ کو سن رشد پہنچنے پر باقاعدہ اداانہ تجارت کرنے کیلئے مکہ کے تاجروں سے متعارف کرایا اور آپؐ نے ان کے مال اور اپنی کے بل پر تجارت شروع کی اور جلد ہی اپنی تجارتی مہارت، معاملہ فہمی، صدق و امانت اور معاملگی سے تاجر حلقہ میں اپنے لیے جگہ بنالی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تجارتی کاروبار کو ہم تین الگ الگ حصوں میں یا زمانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک شادی سے پہلے تک جو لگ بھگ پانچ سال (۵۹۱ء تا ۵۹۶ء) کے عرصہ پر محیط ہے۔ دوسرا شادی اور نبوت کے درمیانی عرصہ پر پھیلا ہوا ہے یعنی پندرہ سال کی مدت پر ۵۹۶ء تا ۶۱۰ء تک اور تیسرا ہجرت مدینہ تک یعنی بقیہ کی دور پر تیرہ سال ۶۱۰ء تا ۶۲۲ء کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ان زمانوں کا تعین روایات و واقعات کے تجزیہ اور قرائن سے تو ہو جاتا ہے مگر آپؐ کی ارتقی مصروفیات اور دوسری چیزوں کی الگ الگ زمانی تعیین ابھی تحقیق طلب بات ہے۔

شادی سے پہلے کا پہلا دور تجارت ہی وہ زمانہ ہے جب آپؐ کی شہرت و حیثیت عام اور معتمنین ہوئی۔ آپؐ نے جن لوگوں کے ساتھ کوئی کاروبار معاملہ کیا انہوں نے آپؐ کی امانت و دیانت، حسن معاملہ اور ماہرانہ تجارتی انداز و طریقہ کا اعتراف کیا۔ ان میں عبد اللہ ابی الحکم سائب بدوی قیس بن سائب مخزومی اور کئی دوسرے اصحاب شامل ہیں۔ وہ سب آپؐ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

آپؐ کے تجارتی اسفار کی حدود شمال میں شام، جنوب میں یمن، جرش، بعلشعہ، مشرق میں تہامہ کے بازار، حباشہ اور بحرین وغیرہ تک کے بازار تک وسیع ہیں آپؐ نے عرب کے متعدد بازاروں میں کاروبار کیا اور شام و جرش کے کئی سفر کیے۔

آپؐ کی امانت داری اور تاجرانہ مہارت سن کر مکہ مکرمہ کے قریشی خاندان بنو اسد کی ایک مالدار بیوہ حضرت خدیجہ بنت خویلد اسدی نے آپؐ کو اپنا مال دے کر شام بھیجا اور مدد کے لیے اپنا ایک غلام میسرہ ساتھ کر دیا۔ آپؐ نے شام کے اس سفر میں دو گنا نفع کمایا۔ میسرہ نے آپؐ کی امانت و دیانت اور کاروباری مہارت کا ذکر واپس آ کر اپنی مالکہ سے کیا اور انہوں نے آپؐ کو دو گنا معاوضہ دیا۔ حضرت خدیجہ نے آپؐ کو دوبار جنوبی عرب کے مشہور

بازار جرش بھیجا اور ہر بار آپؐ نے ان کو زیادہ سے زیادہ نفع دلایا۔ ان تجارتی سفروں اور آپؐ کی عظیم شخصیت نے آپؐ کو پہلی شادی کی راہ ہموار کر دی۔

پہلی شادی:

حضرت خدیجہ قریشی خاندان بنو اسد سے تعلق رکھتی تھیں جو اپنی شرافت، عزت دولت اور تجارت کے لیے ممتاز تھا۔ ان کے ایک بھتیجے حضرت حکیم بن حزام اسدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے دوست اور مکہ کے ممتاز تاجر تھے۔ حضرت خدیجہ خاندانی جاہ و عزت کے علاوہ خود اپنی ذات سے عالی مقام تھیں کہ عفت و طہارت کے سبب طاہرہ کہلاتی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت بھی تھیں اور بڑے اوصاف والی بھی۔ وہ انتی مال دار تھیں کہ کبھی کبھی قریشی کاروان تجارت کا آدھا مال ان کا ہوتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ان کی دو شادیاں ہو چکی تھیں۔ ان کے پہلے شوہر ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی تھے جن سے دو لڑکے ہند اور ہالہ تھے۔ ان کے مرنے کے بعد دوسری شادی عتیق بن عاید مخزومی سے کی جن سے ایک صاحبزادی ہند نامی پیدا ہوئیں۔ دوسری بار بیوہ ہوئیں تو انہوں نے بہت سے پیغامات اور بزرگوں کے اصرار کے باوجود شادی نہ کی۔

لیکن جب آپؐ سے کئی بار تجارتی معاملہ ہوا تو آپؐ کے اخلاق و سیرت سے بہت متاثر ہوئیں چنانچہ چچا ابوطالب اور بعض دوسرے خیر خواہوں کی کوششوں سے حضرت خدیجہ سے شادی ہوئی۔ اس وقت آپؐ کی عمر مبارک پچیس سال تھی۔

یہ واقعہ شادی سے قبل آخری شامی تجارتی سفر کے دو ماہ پچیس دن بعد پیش آیا۔ حضرت خدیجہ کی عمر آپؐ سے زیادہ تھی۔ جمہور علماء کے نزدیک نکاح کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ بلاذری نے ایک روایت میں اٹھائیس سال بیان کی ہے۔ نکاح میں آپؐ کے چچا ابوطالب و حمزہ کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیق اور بعض دوسرے سردار و شیوخ شریک ہوئے۔ خطبہ نکاح ابوطالب نے پڑھا۔ آپؐ نے حضرت خدیجہ کو مہر میں پانچ سو درہم یا بیس اونٹ دیئے۔ اس زمانے میں مستند مہر پانچ سو درہم ہوتا تھا۔

ازدواجی زندگی:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ دونوں ہی کی پسند سے یہ شادی ہوئی تھی اور دونوں اعلیٰ کردار اور عظیم اخلاق والے تھے۔ اس لیے ان کی ازدواجی زندگی خوشیوں سے بھرپور تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ آپؐ کے دل میں زندگی بھر حضرت خدیجہ کی محبت بسی رہی۔ آپؐ ان کو بہترین خاتون سمجھتے تھے۔ ان کا اکثر و بیشتر ذکر فرماتے، ان کے عزیزوں اور سہیلیوں سے حسن سلوک کرتے، دوسری طرف حضرت خدیجہ کا یہ حال تھا کہ اپنا سب کچھ آپؐ پر قربان کر دیا۔

یہ غلط خیال جم گیا ہے کہ حضرت خدیجہ کے مال نے آپؐ کی مفلسی ختم کر کے آپؐ کو مالدار بھی عطا کی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود خوشحال تاجر اور صاحب مال بن چکے تھے اگرچہ مالدار یا متمول نہ تھے۔ عربوں کا دستور تھا کہ عورت کا مال اس کا اپنا ہوتا تھا پھر آپؐ خود اتنے غیور تھے کہ کسی اور کے مال پر تکیہ نہیں کر سکتے تھے۔ شادی کے بعد بھی آپؐ تجارت کرتے رہے۔ یہ بات دوسری تھی کہ اب وہ میاں بیوی دونوں کی مشترکہ تجارت تھی۔ اس سے پورے گھر کو مزید خوش حالی نصیب ہوئی۔ حضرت خدیجہ سے آپؐ کا ازدواجی تعلق تقریباً پچیس سال تک قائم رہا۔ پندرہ برس نبوت سے پہلے اور دس برس نبوت کے بعد۔

حضرت زید کو گود لینا:

شادی کے کچھ دنوں کے بعد حضرت زید بن حارثہ کلبی جب کہ ان کی عمر پندرہ سال تھی بطور غلام حضرت خدیجہ کے پاس آئے۔ ان کو حضرت حکیم بن حزام نے عکاظ کے میلے سے خرید کر اپنی پھوپھی کی نذر کر دیا تھا۔ آپؐ نے حضرت زید کو حضرت خدیجہ سے مانگ لیا یا انہوں نے از خود آپؐ کو ہدیہ کر دیا۔ کچھ مدت بعد حضرت زید کے والد اور چچا وغیرہ کو ان کے بارے میں معلوم ہو تو وہ ان کو لینے آئے۔ آپؐ نے حضرت زید کو اختیار دیا کہ چاہیے جسے چن لیں۔ حضرت زید نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو والدین کے گھر کی آزادی پر ترجیح دی۔ رشتہ دار بخوشی واپس چلے گئے اور آپؐ ان کی اس ادا پر اس قدر مسرور ہوئے کہ حرم کعبہ

میں جا کر قریشی سرداروں کے سامنے زید کو نہ صرف آزاد کرنے کا اعلان کیا بلکہ ان کو بیٹا بنالیا۔ اس بنا پر وہ مدتوں زید بن محمد کہلاتے رہے۔

اولاد نبوی:

ازدواجی زندگی کے پرمسرت پانچ سال ہی گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک فرزند دیا جس کا نام آپؐ نے قاسم رکھا۔ بڑے بیٹے کے نام ہی سے آپؐ کی کنیت ابوالقاسم پڑی جو عرب ثقافت میں سماجی مرتبہ اور اعزاز کی نشانی ہے اور معزز لوگوں کو ان کی کنیت ہی سے خطاب کیا جاتا تھا۔ اس کے ایک برس بعد آپؐ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب پیدا ہوئیں (۶۰۱ء)۔

گھر میں بچوں کی موجودگی سے رونق آئی ہی تھی کہ صاحبزادے قاسم ۶۰۱ء میں دو سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ مگر ۶۰۲ء میں اللہ نے ان کے بدلے ایک اور صاحبزادی عطا کیں جن کا نام رقیہ رکھا گیا۔ ۶۰۳ء میں آپؐ کو تیسری دختر حضرت ام کلثوم پیدا ہوئیں ایک فرزند عبداللہ بھی پیدا ہوئے مگر وہ بھی جلد ہی وفات پا گئے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ آپؐ کے ایک فرزند طاہر بھی تھے جن کا نام آپؐ نے اپنے حقیقی چچا زبیر کے فرزند کے نام پر رکھا تھا۔ ایک اور فرزند طیب کے پیدا ہونے کا ذکر کیا گیا ہے لیکن بعض محققین نے طیب و طاہر دونوں کو حضرت عبداللہ بن محمد کا لقب بتایا ہے۔ حضرت خدیجہ سے آپؐ کی آخری اولاد حضرت فاطمہ تھیں۔ جب آپؐ کی عمر شریف چالیس سال تھی۔ عام طور پر یہ خیال ہے کہ حضرت فاطمہ نبوت کے سال یعنی ۶۱۰ء میں پیدا ہوئیں۔

آپؐ کے گھر میں اپنی اولادوں کے علاوہ حضرت خدیجہ کے پہلے تین بچے بھی آپؐ ہی کے زیر سایہ رہتے تھے یعنی ہند بن ابی ہالہ، ہالہ ابن ابی ہالہ اور ہند بنت عقیق ان کے ساتھ ساتھ حضرت زید بن حارثہ، حضرت ام ایمن جو آپؐ کی دایہ تھیں اور بعض دوسرے موالی (غلام و آزاد کردہ غلام) بھی رہتے تھے۔

حضرت زید آپؐ کے متبنی (گود لیے ہوئے) فرزند تھے۔ نبوت سے پانچ چھ برس قبل

جب آپؐ کے چچا ابوطالب کی مالی حالت دگرگوں ہوئی اور مکہ میں قحط و خشک سالی کی بنا پر سخت گرانی پیدا ہو گئی تو آپؐ نے اپنے شفیق چچا اور مربی کا بوجھ کم کرنے کے لیے ان کے چھوٹے فرزند حضرت علیؑ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ جناب ابوطالب کی کافی اولادیں تھیں۔ ان کے دوسرے فرزند جعفرؑ کو حضرت عباسؑ نے جو کافی مال دار تھے اپنی کفالت میں لے لیا۔

سماجی زندگی:

مکی تجارت میں حصہ لینے کے علاوہ آپؐ نے دوسرے عوامی کاموں میں بھی خوب حصہ لیا۔ تجارت کی وجہ سے آپؐ کی دیانت و امانت کی اتنی شہرت ہوئی کہ آپؐ کو مکہ کے لوگوں نے بالاتفاق ”الصادق“ (سچا) اور ”الامین“ (امانت دار) کے خطابات دیئے اور آپؐ کے گھر میں اپنی رقمیں اور ساز و سامان بطور امانت رکھوانے لگے جب ضرورت پڑتی لے جاتے اور آپؐ کے کردار اور حسن اخلاق کا چرچا کرتے۔ عمر کے اس مرحلہ میں دواہم واقعات پیش آئے جن سے آپؐ کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہوا۔ ان سے آپؐ کے سماجی مرتبہ اور خیر و فلاح کے کاموں میں حصہ لینے کا بھی پتہ چلتا ہے۔

خانہ کعبہ کی نئی تعمیر:

بارش کے پانی اور زمانہ کے سرد و گرم کے سبب خانہ کعبہ کی عمارت خستہ ہو چکی تھی۔ لہذا ۶۰۵ء میں جب آپؐ کی عمر شریف پینتیس سال تھی، قریش مکہ نے اپنی حلال کی کمائی اور سود سے پاک مال سے خانہ کعبہ کی عمارت کو نئے سرے سے بنانے کا فیصلہ کیا۔ سرداروں اور بزرگوں کے مشورے سے عمارت کو ڈھایا گیا اور قریش کے ہر خاندان کے لیے عمارت تعمیر کرنے کا حصہ متعین کیا گیا۔

آپؐ نے اپنے خاندان بنو عبد مناف کے لیے متعین حصہ کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا۔ پھر ڈھوئے اور دوسرے کئی کام کئے جب حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کا وقت آیا تو ہر قبیلہ جھگڑنے لگا کہ وہ اس شرف کا زیادہ حقدار ہے۔ قریب تھا کہ جنگ و جدال کی نوبت آ جاتی مگر کسی نے مشورہ دیا کہ جو شخص مسجد حرام کے دروازے (باب بنی شیبہ یا باب الصفا) سے سب سے

پہلے داخل ہو اس کا فیصلہ مان لیا جائے۔ تقدیر الہی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس دروازے سے داخل ہوئے اور سب نے بخوشی آپؐ کو حکم بنالیا۔

آپؐ کا فیصلہ آپؐ کی دوراندیشی فہم و فراست اور حکمت عملی کا نمونہ تھا آپؐ نے ایسا طریقہ اختیار فرمایا کہ تمام قبیلوں کو حجر اسود نصب کرنے کا شرف مل گیا اور کسی کو تکدر نہ ہوا۔ آپؐ نے ایک چادر منگوا کر اس کے پتوں اپنے ہاتھ سے حجر اسود رکھا اور قریشی سرداروں سے کہا کہ وہ سب چادر پکڑ کر اس کو حجر اسود کے نصب کرنے کی جگہ تک لائیں۔ انہوں نے بخوشی ایسا کیا اور پھر آپؐ نے اپنے دست مبارک سے اس کو نصب کر دیا۔ سب کو آپؐ کے فیصلے اور طریقے سے نہ صرف خوشی ہوئی بلکہ وہ آپؐ کی سوجھ بوجھ، دانائی اور دوراندیشی کا لوہا مان گئے۔

حلف الفضول میں شرکت:

مکہ مکرمہ کے لوگ آپؐ کے اخلاق و دیانت اور فہم و فراست سے متاثر تھے اس لیے اکثر آپؐ سے اپنے جھگڑے چکانے اور معاملات طے کرانے کیلئے رجوع کیا کرتے تھے لیکن ایسی کوئی مستقل مجلس نہ تھی جو مکہ مکرمہ میں ظلم و استحصا کے خلاف کام کرتی۔ شخصی اثرات اجتماعی قوت سے محروم ہوتے ہیں۔ ۶۰۵ء میں جب آپؐ کی عمر شریف پینتیس سال تھی قریش کے بعض اچھے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک معاہدہ کیا جائے جس کے تحت مکہ میں کسی پر ظلم نہ کیا جاسکے۔ بعض مورخین نے اس معاہدہ کا سال ۵۹۱ء یا عام الفیل لکھا ہے۔

بہر حال حضرت ابو بکر صدیق کے ایک عزیز اور مکہ کے مالدار و مخیر تاجر عبداللہ بن جدعان تمیمی کے گھر بنو ہاشم، بنو زہرہ، بنو اسد بنو مطلب بنو تیم اور غالباً بعض اور لوگ بھی جمع ہوئے اور یہ معاہدہ کیا گیا۔ چوں کہ اس معاہدہ کے الفاظ میں الفظ فضول (چھینی ہوئی فاضل رقم) آتا تھا، اس لیے یہ نام پڑا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر مظلوم کی مدد کی جائے۔

بعض جدید مورخین اور سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ عارضی اور بیکار معاہدہ تھا جس کا اثر نہیں ہوا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ حلف الفضول کافی کارگر ہوا اور اس کی اجتماعی قوت نے کئی بار مظلوموں کی دادرسی کی۔ عاص بن وائل سہمی نے اس سے مجبور ہو کر ایک زبیدی (یمینی) تاجر کا چھینا ہوا مال واپس کیا۔ دوسرے موقع پر بنو حجاج کے ایک مالدار تاجر اور سرمایہ دار امیہ ابن خلف

نے ایک شمالی تاجر کی رقم لوٹائی۔ ایک تیسرے تاجر عبیدہ بن جراح سہمی نے قبیلہ خثعم کی باندی اسی معاہدہ کے زیر اثر واپس کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاہدہ کے اثرات کافی وسیع اور دیرپا رہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معاہدہ بہت پسند تھا کہ آپؐ اس کے ایک شریک تھے۔ آپؐ اس کی اہمیت سرخ اونٹوں سے زیادہ سمجھتے تھے جو عرب میں سب سے زیادہ قیمتی شے سمجھے تھے۔ بعثت کے بعد بھی آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ ایسے معاہدہ میں شرکت کی دعوت ملے تو میں بخوشی شریک ہوں گا۔

سماجی تعلقات:

تجارت و عزیز داری اور پڑوس کے سبب آپؐ کے تعلقات یوں تو سب سے اچھے تھے اور سب آپؐ کے حس اخلاق کے گردیدہ تھے لیکن مکہ مکرمہ میں آپؐ کے دوستانہ تعلقات اور قریبی روابط چند مخصوص لوگوں سے تھے۔ یہ سب کی صالح نوجوان، باکردار اشخاص اور معزز و شریف لوگ تھے۔

ان میں اہم ترین اور قریب ترین دوست اور عزیز رفیق حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ تھے۔ اگرچہ ان سے جان پہچان اور عام تعلقات تو بچپن سے تھے لیکن رفاقت و دوستی کا خاص تعلق آپؐ سے بیس سال کی عمر میں ہوا۔ وہ آپؐ سے دو سال چھوٹے تھے۔ ابوبکر تیمی نہ صرف ایک معزز قریشی خاندان کے رکن تھے بلکہ قریشی اشرافیہ میں دیت و مغارم کے عہدہ دار بھی تھے۔ مالدار تاجر اور باعزت شہری ہونے کے علاوہ انساب عرب کے ماہر تھے۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے شراب کو کبھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ وہ اخلاقی لحاظ سے بہت بلند تھے۔ نیک کام کرتے، غریبوں کی مدد کرتے اور مصیبت کے ماروں کے دکھ درد کا مداوا کرتے تھے۔

حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی آپؐ کے چچا تھے لیکن صرف چار سال بڑے ہونے کے سبب آپؐ کے ہم عمر ہی تھے۔ وہ آپؐ کے رفیق بھی تھے۔ دوسرے چچا حضرت حمزہ آپؐ کے چچا ہونے کے ساتھ خالہ زاد اور رضاعی بھائی بھی تھے۔ وہ آپؐ سے صرف دو سال بڑے تھے۔ تمام احترام و لحاظ کے باوجود ان سے دوستانہ روابط تھے۔ حضرت خدیجہ کے بھتیجے حضرت حکیم بن

حزام بھی آپ کے احباب خاص میں تھے۔ وہ مالدار اور معزز تاجر ہونے کے ساتھ صاحب خیر بھی تھے۔ انہوں نے بنو نوفل سے رفاہ اور بنو عبدالدار سے دارلندوہ کی عمارت خرید لی تھی اور ان کے عہدہ دار بن گئے تھے۔ جاہلی دور میں بھی وہ اکثر غلام آزاد کیا کرتے تھے۔ وہ دوسرے اہم کاموں خاص کر ہر کار خیر میں حصہ لیا کرتے تھے۔

ان کے علاوہ حضرت عمار بن یاسر مذہبی، عبداللہ بن مسعود ہذلی، صہیب بن سنان نمری، ضامد بن ثعلبہ ازدی، ابوسلمہ مخزومی اور عبداللہ جحش اسدی (بنو خزیمہ) وغیرہ بھی آپ کے قریبی احباب اور رفقاء میں تھے۔ ابوسلمہ مخزومی تو آپ کے پھوپھی زاد بھائی اور رضاعی بھائی بھی تھے۔ اسی طرح حضرت عثمان بن عفان اموی آپ کی پھوپھی ام حکیم البیضاء کی بیٹی اردی کے فرزند اور آپ کے بھانجے لگتے تھے۔

عام کی سماج میں آپ غریبوں کا کام کرتے مفلس و مہمان کو کھلاتے، بے زر کو مال دیتے، غریبوں کے کام آتے اور اجنبیوں کی مدد کرتے تھے۔ غرضیکہ ہر کس و ناکس کی مدد اور امداد آپ کے کردار کا لازمی حصہ تھا۔

احناف یا حنفیت:

شروع ہی سے آپ مکہ مکرمہ اور قریش کے معاشرے سے خوش نہ تھے۔ سن رشد کو پہنچے تو آپ کی روحانی بے چینی اور دماغی اضطراب میں اضافہ ہوا۔ مکہ کے کئی صالحین اور اہل دانش حالات کی رفتار سے مطمئن نہ تھے۔ ان میں سے کئی لوگ از خود شراب، جوئے زنا اور دوسرے برے کاموں سے بچنے لگے تھے، ان میں عبداللہ بن جدعان تیمی، عثمان بن عفان اموی اور ابوبکر تیمی وغیرہ شامل تھے۔

زیادہ بے چین روحوں نے دین حق کی تلاش شروع کر دی کہ وہ اپنے قومی مذہب سے متنفر تھے۔ دین ابراہیم کا نام تو سن رکھا تھا اور اس کے نام لیوا بھی تھے مگر اس کی حقیقت نہ جانتے تھے۔ بہت تلاش و کوشش کے بعد ان لوگوں نے بت پرستی اور مشرکانہ رسوم ترک کر دیں اور اپنے آپ کو موحد و حنیف کہنے لگے۔ وہ اللہ کی عبادت تو کرتے تھے مگر اس کا صحیح طریقہ

نہیں جانتے تھے۔

ان احناف میں چار اشخاص ممتاز ہیں۔ ان کے نام ہیں: ورقہ بن نوفل اسدی، زید بن نفیل عدوی، عثمان بن الحویرث اسدی، عبید اللہ بن جحش اسدی۔ ان سب سے آپؐ کی جان پہچان تھی۔ ورقہ تو آپؐ کے قریبی عزیز تھے کہ حضرت خدیجہ کے عم زاد تھے۔ جب کہ عبید اللہ جحش آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ زید بن نفیل سے آپؐ کی کئی ملاقاتوں کا ذکر آتا ہے۔ قس بن ساعدہ کے موحدانہ خطبے آپؐ نے کئی بار سنے تھے۔ ابن قتیبہ دینوری نے چھ مزید اختلاف کا ذکر کیا ہے۔

ان لوگوں کے طرز عمل سے اگرچہ کسی تو حیدی یا موحدانہ تحریک کی داغ بیل تو نہیں پڑی تاہم اس نے بہت سے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا اور ان کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ آپؐ اکثر اور ماہ رمضان میں خاص کر پورے ماہ تک غار حرا میں قیام کرتے۔ وہاں عبادت (تخت) کرتے اور غور و فکر کیا کرتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپؐ زیادہ سے زیادہ خلوت گزیر ہوتے گئے اور روحانی کرب و اضطراب کا اثر آپؐ پر نمایاں ہونے لگا۔ یہ آثار آپؐ کی رسالت کے تھے۔

بعثت نبوی

بعثت سے پہلے کی حالت:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام فطری استقامت، قدرتی صالحیت اور روحانی و ذہنی بے چینی کے باوجود دین کا صحیح علم حاصل نہیں تھا جس کی بنیاد وحی الہی پر ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپؐ کو دوسرے معاصر لوگوں کی مانند رسالت کے ادارے کا علم تھا اور کسی حد تک اللہ کا تصور بھی تھا لیکن ان کا صحیح علم نہ تھا

یہ بھی صحیح ہے کہ اس زمانہ کے اہل علم جانتے تھے کہ ایک نبی آخر الزماں تشریف لانے والے ہیں اور ان کی پیش گوئیوں کے سبب عام لوگ بھی ان کے منتظر ہو گئے تھے مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ کب اور کہاں ان کا ظہور ہوگا اور وہ کون ہوں گے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگ آپؐ کے اعلیٰ کردار اور پاکیزہ شخصیت سے متاثر تھے لیکن کسی کو آپؐ کے نبی بننے کا گمان بھی نہ تھا اور تو اور خود آپؐ کو بھی اس کا خیال نہ آیا تھا۔ خود قرآن مجید اعلان کرتا ہے کہ ”آپؐ کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔“

ماکنت تدری ما الکتاب ولا الا ایمان (شوریٰ ۵۲) اور آپؐ کو امید نہ تھی کہ آپؐ کی طرف کتاب اتاری جائے گی: وَمَا كُنْتَ تَرَىٰ جَوَانَ يَلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابَ (نقص ۸۶) پھر قرآن نے بعثت سے قبل آپؐ کی زندگی کو ضلال (صحیح دین سے ناواقفیت) قرار دیا ہے: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ (ضحیٰ ۷) اور اللہ نے آپؐ کو بے راہ پایا پھر ہدایت دی، اس لیے وہ تمام روایات اور پیش گوئیاں جو آپؐ کی پیدائش کے قبل یا بعثت سے

پہلے آپؐ کے نبی ہونے کا اعلان کرتی ہیں قرآن مجید کے خلاف ہیں اور اس لیے صحیح نہیں ہیں۔
بعثت کی سنت الہی:

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ وہ انبیاء اور رسولوں کے انتخاب و بعثت سے قبل کسی کو اور خود ہونے والے رسول کو بھی نبی بنانے کی پہلے سے خبر نہیں دیتا۔ اس کی زندگی کو ایک طویل مدت تک جو عام طور پر چالیس برس پر محیط ہوتی ہے اعلیٰ اخلاق و کردار کی بناتا ہے تاکہ سابقہ زندگی کو اور عام بے خبری کی حالت کو اس کی نبوت و رسالت پر دلیل بنائے۔ یہ انتخاب اچانک ہوتا ہے اور اس کا اعلان اس سے بھی زیادہ ہنگامی۔ جیسا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے معاملہ میں ہوا۔

نبوت محمدی:

رویائے صادقہ: دوسری سنت الہی یہ ہے کہ منتخب رسول اور چیدہ نبی کو ذاتی طور سے تیار کرنے کے لئے اس کی نبوت کا آغاز سچے خوابوں (رویاء صادقہ) کے دکھانے سے ہوتا ہے۔ رات یا دن نیند میں جو خواب دیکھتے ہیں وہ بیداری میں صورت واقعہ بن جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیوی، محرم راز اور عورتوں میں سب سے بڑی عالمہ حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی میں سے جو چیز سب سے پہلے آنی شروع ہوئی وہ رویاء صالحہ (سچے خواب) تھے جو نیند میں دیکھتے اور جب کوئی خواب دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی مانند سچا ہو جاتا۔“

وحی کے بارے میں یہ جان لینا چاہئے کہ وہ کئی قسم کی ہوتی ہے: رویائے صادقہ، القاء، الہام، پردے کے پیچھے سے کلام الہی، فرشتے کے ذریعہ پیغام رسانی، فرشتوں کے ذریعہ تعلیم کا نزول وغیرہ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شروعات سچے خوابوں کے دیکھنے سے ہوئی روایات میں اتفاق ہے کہ جب آپؐ نے چالیس برس کی عمر پوری کی تو آپؐ نبی بنائے گئے۔ یہ دو شنبہ کا دن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ اور واقعہ الفیل کا سال اور آپؐ کی پیدائش کے بعد اکتالیسویں سال کا پہلا دن تھا جو سنہ عیسوی کے مطابق ۶۱۰ء تھا اور سنہ اسلامی کے مطابق ۱۲ ربیع الاول ۴۱ نبوی۔

روایہ صادقہ کی مدت و مقصد:

سچے خواب دیکھنے اور ان کے واقعہ بننے کا سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران آپؐ غیبی آوازیں سنتے، شجر و حجر سلام کرتے اور طرح طرح کے غیبی معاملات پیش آتے۔ ان سب کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ کو رسول ہونے کے اہم منصب کا احساس دلائیں اور آپؐ کے دل کو مضبوط و ثابت بنائیں تاکہ آپؐ اللہ کے اترنے والے کلام کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کر سکیں۔ وہ کلام الہی جسے اگر پہاڑ پر اتار دیا جاتا وہ ریزے ریزے ہو کر بکھر جاتا (سورہ حشر ۲۱) اور جس بار امانت کو اٹھانے سے آسمان، زمینوں اور پہاڑوں نے اپنی کوتاہی کے سبب انکار کر دیا مگر جسے انسان نے اٹھالیا (سورہ احزاب ۷۲) جہاں تک آپؐ کے اپنے رسول ہونے کا یقین کا تعلق ہے وہ پہلے لمحہ سے تھا اور کامل تھا۔

ان عجیب و غریب واقعات کا ذکر آپؐ نے اپنی رفیق حیات حضرت خدیجہ سے کیا تو انہوں نے آپؐ کی تصدیق کی اور تسلی دی۔ مزید اطمینان دلانے کیلئے وہ آپؐ کو اپنے چچا زاد بھائی حضرت ورقہ بن نوفل اسدی کے پاس لے گئیں جو حنیف سے عیسائی اور تورات و انجیل کے عالم بن چکے تھے۔ انہوں نے بھی آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی اور آپؐ کو اطمینان دلا کر آئندہ کے لیے تیار کیا۔ حضرت ورقہ بن نوفل سے آپؐ کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔

روایہ صادقہ کی مدت چھ ماہ پر محیط تھی اور یہ آپؐ کی نبوت کا پہلا زمانہ ہے۔ یہ نبوت کا دیباچہ اور تمہید نہیں تھی بلکہ اصل نبوت و بعثت تھی۔ اسی لیے آپؐ نے سچے خوابوں کا نبوت کا چھیا سیواں حصہ قرار دیا ہے۔ صحیح پیشگوئیوں کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس بعثت پر سرفرازی کے بعد آپؐ کی خلوت نشینی اور بڑھ گئی اور آپؐ غار حرا میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگے۔ یہ اصل و صحیح تخت (عبادت) تھی۔

اولین نزول قرآن:

رمضان ۱۲ نبوی ۶۱۰ء میں جب آپؐ کی عمر شریف چالیس سال چھ ماہ ہو چکی تھی اور آپؐ غار حرا میں عبادت کے درمیان محو خواب تھے کہ آپؐ نے بعثت کے ابتدائی دور کا آخری

خواب دیکھا۔ حضرت جبریل علیہ السلام ایک ریشمی جزدان (نما دیباچ) میں لپی ایک کتاب لائے اور آپؐ کے سامنے اس کو رکھ کر کہا کہ پڑھیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ انہوں نے دوبار اور کہا اور دونوں بار آپؐ کو بھینچا۔ تیسری بار آپؐ نے ان سورۃ اقرء کی ابتدائی پانچ آیات پڑھیں۔ جب آپؐ نیند سے بیدار ہوئے تو آپؐ نے محسوس کیا کہ وہ پانچوں آیات آپؐ کے سیدہ مبارک میں تحریر کی مانند نقش ہیں۔ بعد میں اسی رات (لیلۃ القدر میں) یہی واقعہ آپؐ کے ساتھ بیداری میں پیش آیا اور آپؐ نے وہ آیات بہ ہوش و حواس حضرت جبریل سے سنیں۔

حضرت خدیجہ اور حضرت ورقہ کی تصدیق:

کلام الہی کے جلال و گراں باری نے آپؐ کو لرزاں کر دیا اور آپؐ کا بچتے لڑتے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ پہاڑ کے بیچ میں ایک بار پھر حضرت جبریل نظر آئے اور انہوں نے آپؐ کی رسالت کی تصدیق مزید کی۔ آپؐ گھبرائے ہوئے گھر پہنچے اور کھبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ سارا ماجرا حضرت خدیجہ کو سنایا۔ انہوں نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی اور آپؐ کے اوصاف گنا کر آپؐ کو تسلی اور تشفی دی۔ وہ ایک بار پھر آپؐ حضرت ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ انہوں نے نہ صرف آپؐ کی رسالت کی تصدیق کی بلکہ حضرت جبریل اور کلام الہی کی تصدیق کر کے آپؐ کے پیغام کو حضرت موسیٰ کے پیغام کی مانند قرار دیا۔ اور آئندہ مشکل زندگی کی پیش گوئی کی اور آپؐ کی کامیابی کی خبر دی۔

قرآن مجید کی ان پانچ آیات کے نزول کے ساتھ آپؐ پر تنزیل قرآن کا سلسلہ شروع ہوا جو آپؐ کی بعثت کے چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ قرآن مجید نے اس کو شب قدر میں نازل کرنے کی بات کہی ہے۔ اس مبارک رات کی تعیین و تاریخ میں علماء و سیرت نگاروں کا اختلاف ہے۔ زیادہ اقوال ۲۷ تاریخ کے ہیں اور بعض نے ۷ رمضان تسلیم کیا۔

اسلام کی پہلی تعلیم:

قرآن کریم کی پہلی تنزیل کے بعد جس میں توحید و رسالت کی تعلیم موجود تھی آپؐ کو

حضرت جبریل نے وضو کرنے اور نماز پڑھنے کی عملی تعلیم دی۔ شروع میں صرف دن میں ایک بار دو رکعت نماز کا حکم دیا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو اور نماز کا طریقہ حضرت خدیجہ کو سکھایا جو روز اول سے مسلمان تھیں۔ حکم الہی کے مطابق آپؐ اور حضرت خدیجہ چھپ چھپ کر نماز پڑھتے تھے کہ ابھی اللہ کا حکم ظاہر کرنے کا نہ تھا۔

فترہ وحی:

وحی یعنی قرآن مجید کی پہلی آیتیں اترنے کے بعد یہ سلسلہ رک گیا تا کہ آپؐ کے دل کی مضبوطی مکمل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام میں تدریج اور منزل بہ منزل کام کرنے کی سنت جاری ہے۔ قرآن مجید کا اترنا بھی اسی طرح تھا۔ عارضی طور پر وحی رکنے کو فترہ کہا جاتا ہے۔

تبلیغ کا حکم اور پہلے مسلمان:

کچھ مدت کے بعد جو عام طور سے چالیس دن مانی جاتی ہے۔ سورہ مدثر کی ابتدائی آیات اتریں۔ ان میں اللہ کی طرف سے آپؐ کو حکم ہوا کہ لوگوں میں اللہ کے دین کو خفیہ طریقہ سے پھلائیں۔ حضرت خدیجہ تو بلا تبلیغ مسلمان ہو چکی تھیں اور بالاتفاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلی مسلمان تھیں۔ ان کے بعد ابوبکر تیمی نے بلا جھجک اسلام قبول کر لیا، اسی لیے وہ صدیق کہلائے۔ آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے علاوہ آپؐ کی تمام بیٹیاں..... زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ..... اور دوسرے سوتیلے، بیٹیاں بھی مسلمان ہو گئے۔ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی دس گیارہ سال کی عمر میں ہی مسلمان ہو گئے۔ عام طور سے وہ پہلے چار مسلمانوں میں شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ واقعہ شوال ذوقعدہ ۱۱ نبوی / جنوری، فروری ۶۱۱ء کا ہے۔

خفیہ تبلیغ کا تین سالہ زمانہ:

اسلام کی تبلیغ کا پہلا دور خفیہ تبلیغ کا ہے جو تین سال ۳-۱۱ نبوی ۶۱۰-۶۱۱ء محیط ہے۔ اس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خفیہ تبلیغ کرتے ہی رہے مگر ساتھ ہی آپؐ کے سچے جاں نثار اور مبلغ حضرت ابوبکر صدیق بھی اپنے دوستوں اور عزیزوں کے حلقوں میں اسلام پھیلاتے

رہے۔ ان کی کوششوں سے حضرت عثمان بن عفان اموی، حضرت زبیر بن عوام اسدی، حضرت عبدالرحمن بن عوف زہری، حضرت سعد بن ابی وقاص زہری اور حضرت طلحہ عبید اللہ تمیمی اسلام لائے۔ پھر یہ سلسلہ جاری رہا اور حق کے متلاشی اور نیک روحوں والے برابر اسلام لاتے رہے۔

اولین مسلمانوں کا تجزیہ:

اس دور میں جو لوگ اسلام لائے ان کے بارے میں چند باتیں جانتی ضروری ہیں کیوں کہ ان سے اسلام کی سچائی اور تاریخ کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ اول یہ کہ مکہ مکرمہ کے قریشی اور غیر قریشی تمام خاندانوں کے بہت سے لوگ اسلام لائے۔ ان خاندانوں بنو ہاشم بنو عبد المطلب، بنو عبد شمس، بنو امیہ، بنو امیہ کے حلیفوں میں سے خاندان بنو غنم بن دودان، اسد خزیمہ، بنو تیم، ان کے حلیف بنو نمربن قاسط، بنو اسد، بنو عبد الغری بنو زہرہ اور ان کے حلیف بنو ہذیل، بنو کنذہ، بنو تمیم وغیرہ، بنو عدی اور ان کے حلیف بنو بکیر وغیرہ بنو عبد الدار بنو جح، بنو سہم اور ان کے حلیف، بنو مخزوم اور ان کی مذحجی حلیف، بنو عامر بن لوی، بنو فہر بن مالک، بنو عبد قصی شامل تھے۔ خاندانوں کی تعداد دودرجن سے زیادہ تھی۔

دوم یہ کہ یہ سب معزز خاندانوں کے لوگ تھے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر نوجوان تھے بہت کم لوگ زیادہ عمر کے تھے۔

سوم یہ کہ اکثر و بیشتر پورے پورے خاندان مسلمان ہو گئے تھے جیسے خاندان رسالت خاندان ابوبکر، خاندان عمار وغیرہ۔

چہارم یہ کہ ابتدائی مسلمانوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ ان میں شادی شدہ عورتیں، کنواری لڑکیاں اور کمسن بچے شامل تھے۔

پنجم یہ کہ متعدد کنیزیں اور غلام بھی مسلمان ہو گئے تھے، جیسے حضرت بلال، حضرت ام ایمن حضرت زنیئرہ، حضرت ام عیس، حضرت ابو قلیبہ، حضرت عامر بن فہیرہ، حضرت لبنیہ وغیرہ۔

ششم یہ کہ کسی قبیلہ یا خاندان نے اسلام کی مخالفت یا اس کا انکار قبائلی عصبیت یا دشمنی کی وجہ سے نہیں کیا تھا۔

ہفتم یہ کہ اس تین سالہ دور کے کل مسلمانوں کی تعداد کئی سو سے اوپر تھی۔

اسلام کی دعوت:

آخر اسلام کی وہ کون سی دعوت تھی جو لوگوں کو اپنا آبائی دین اور پرانا طریقہ چھوڑنے پر آمادہ کر دیتی تھی؟ عام الفاظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید، رسالت اور آخرت کے عقیدوں کی تعلیم دی۔ نیک اور اچھے اخلاق سکھائے، پاک چیزوں کا حکم کیا اور نماز و طہارت کی عملی مشق کرائی۔

۱۔ توحید: اسلام کی اصلی دعوت جس نے لوگوں کو کھینچا قرآن مجید کی ان ابتدائی سورتوں میں موجود ہے جو مکہ میں اتری تھیں۔ توحید الہی کی تعلیم یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو الٰہ و معبود اور مالک و آقا مانا جائے۔ اس کے سوا کسی اور کو نہ تو عبادت کے لائق مانو۔ نہ اس کی عبادت کرو اسی کو سارے جہان کا مالک مانو اور دینا و کائنات کی ہر شے پر قادر اور متصرف سمجھو۔ نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرو۔

ب۔ رسالت: اسی اللہ نے اپنے بندوں کو صحیح راہ دکھانے کے لیے شروع سے ضرورت کے وقت رسول بھیجے۔ ان میں آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ قیامت تک تمام لوگوں کے رسول و نبی ہیں۔ ان کو مانو اور ان کی اطاعت و پیروی کرو۔ ان کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلو۔ ان کے احکام مانو۔ جس چیز سے وہ روکیں اس سے رک جاؤ۔ ایمان سب رسولوں پر رکھو مگر پیروی صرف ان کی کرو۔

ج۔ آخرت: اللہ نے یہ دنیا ایک خاص مقصد سے بنائی ہے۔ وہ مقصد ہے اچھائی یعنی خیر اور برائی شر پر چلنے والوں کا امتحان لینا۔ جو نیک کام کریں۔ اللہ اور رسول کو مانیں ان کو دنیا اور آخرت کی بھلائی دینا اور جو برے کام کریں اور اللہ و رسول کو نہ مانیں، ان کو ان کے برے اعمال پر سزا دینا۔ یہ جزا و سزا کا اصلی دن قیامت کا دن ہوگا، جب یہ دنیا ختم کر کے سب کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ اچھوں کو جنت ملے گی اور بروں کو جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اس عقیدہ پر ایمان رکھنا آخرت و معاد کا عقیدہ ہے۔

د۔ مسلم کے فرائض: اس لیے مسلم کا فرض ہے کہ اچھے کام کرے۔ اللہ کے بتائے ہوئے فرض جیسے نماز وغیرہ ادا کرے۔ مسلمانوں کی مدد کرے۔ سچ بولے، جھوٹ سے بچے، کسی پر ظلم نہ کرے، مظلوم کا ساتھ دے ظالم کو روکے، پڑوسی اور ملک والوں کی مدد کرے۔ غریبوں کو کھانا کھلائے اور ان کی امداد کرے۔ مہمان نوازی کرے، مفلس، یتیم، بیوہ کی مدد کرے، سب کا حق ادا کرے۔ حلال روزی کمائے اور کھائے، حرام چیزوں سے بچے۔ امانت داری سے رہے، وعدے پورے کرے۔ غرضیکہ پاک و صاف زندگی بسر کرے۔ اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

س۔ اسلام کا اثر: اسلام کی ان اچھی اور سچی تعلیمات نے ان کے دل موہ لیے تھے۔ بنیادی سبب ان کے اسلام لانے کا یہی تھا۔

قرآن کی تاثیر:

ان اچھی وہ عمدہ تعلیمات میں مزید اثر اللہ کے کلام سے پیدا ہوا تھا۔ قرآن مجید کی عربی زبان اتنی ادبی اور دلکش ہے کہ وہ ان پہلے مسلمانوں کو جو عرب تھے مسحور کر لیتی۔ وہ جان جاتے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا یقیناً اللہ کا کلام ہے اور وہ مسلم بن جاتے۔

ذات نبوی کی مقناطیت:

پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات تھی۔ وہ آپ کے کردار اور اخلاق سے پہلے ہی سے متاثر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی دھوکہ نہیں دیا۔ پھر آپ اللہ پر کیوں جھوٹ باندھیں گے۔ لہذا وہ آپ کی سیرت و شخصیت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتے تھے۔

اصلاح حال کی خواہش:

دیناوی کامیابی اور آخرت کی بھلائی کے علاوہ ان کے اپنے معاشرہ اور زندگی میں پھیلی ہوئی افراتفری اور گندگی سے وہ جب اسلام کا موازنہ کرتے تو ان کو اپنی زندگی جھوٹی اور اسلام سچا دکھائی دیتا۔ ظاہر ہے کہ اچھے دل اور صاف دماغ والوں کے لیے اسلام قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اولین مرکز کا قیام:

مکہ مکرمہ میں جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان کے لئے ایک مشکل یہ تھی کہ وہ کیسے اپنے دین کو چھپائے رکھیں تاکہ ان کے گھروالے اور قریش کے سردار مخالفت نہ کرنے لگیں۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی تعلیم کیسے اور کہاں حاصل کریں۔ اس سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ اسلام کے سب سے بڑے رکن نماز کو کس جگہ ادا کریں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے اکثر و بیشتر مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں مکہ کی کسی گھاٹی اور پہاڑوں کے دروں میں بلا لیتے۔ وہاں وہ باجماعت نماز پڑھتے اور دین سیکھا کرتے۔ ابوطالب ہاشمی نے ایک دن آپ کے ساتھ حضرت خدیجہ اور حضرت علی کو نماز پڑھتے دیکھا تو پوچھا یہ کون سا دین ہے؟ وہ تو آپ کے حامی تھے۔ انہوں نے کچھ نہ کہا بلکہ حضرت علی کو آپ کی پیروی کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

مگر سب ایسے نہ تھے۔ مسلمانوں کے ایک گروہ کو مکہ کے کچھ سرداروں نے اسی طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو برا بھلا کہنے لگے۔ معاملہ بڑھا تو نوبت لڑائی تک پہنچ گئی۔ حضرت سعد بن وقاص نے ایک شخص کو ہڈی مار کر زخمی کر دیا اور دوسروں نے پتھر مار مار کر انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے واقعات کا سد باب کرنے کے لئے ایک محفوظ جگہ پر ایک اسلامی مرکز قائم کرنے کا سوچا۔ بنو مخزوم کے ایک اہم مسلمان حضرت ارقم بن ابی ارقم مخزومی نے اپنا مکان پیش کر دیا جو حرم کے قریب کوہ صفا کی تلہی میں الگ تھلگ واقع تھا آپ نے اسی کو اسلامی مرکز بنا لیا۔ وہ دار ارقم کے نام سے تاریخ اسلامی میں مشہور ہے۔ خفیہ تبلیغ کے تقریباً ڈھائی سال گزرنے کے بعد ۳۳ نبوی ۶۱۳ء کے وسط میں یہ مرکز قائم ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی مرکز میں طویل قیام فرماتے اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا کام کرتے۔

علانیہ تبلیغ:

تین سالہ خفیہ تبلیغ کے دوران مکہ مکرمہ میں دین اسلام کوئی راز نہیں رہا تھا۔ راز رکھنا مقصود بھی نہ تھا۔ صرف اسلام کے لیے زمین ہموار کرنا، نو مسلموں کو محفوظ رکھنا ایک جماعت پیدا کرنا،

ان میں تنظیم قائم کرنا اور بلاوجہ کی مخالفت سے بچانا مقصود تھا۔

جب یہ مقاصد حاصل ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت نے چاہا تو ۳۳ نبوی ۶۱۳ء کے بعد اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ اسلام کی طرف علانیہ دعوت دیں۔ اللہ کے تاریخ ارتقاء کے اصول کے مطابق پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو باخبر کرنے کا حکم ہوا۔
وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ. (شعراء ۱۱)

۱۔ قریبی اعزہ کو تبلیغ:

آپؐ نے اس حکم کی تعمیل میں اپنی پھوپھیوں کے مشورے سے اپنے خاندان بنو عبد مناف کے مردوں اور عورتوں کو ایک گھر میں دعوت پر بلایا۔ ان کے سامنے اسلام پیش کیا مگر آپؐ کے چچا ابولہب نے آپؐ کو بات پوری کرنے نہ دی اور مجلس خراب کر دی۔ آپؐ نے دوسری بار ان کی دعوت کی اور پھر دین حق پیش کیا۔ ابولہب نے پھر مجلس خراب کرنی چاہی مگر سنجیدہ لوگوں نے آپؐ کی بات سنی۔ آپؐ نے ان کو ایک اللہ کی عبادت کرنے، آپؐ کو رسول اللہ ماننے، نیک کام کرنے، آخرت کی تیاری کرنے اور دوسرے اعمال صالحہ کے ذریعے دینا سنوارنے کی دعوت دی۔ لوگوں نے اگرچہ نرمی سے کلام کیا لیکن کسی نے قبول نہ کیا۔

ب۔ اعلان عام:

رشتہ داروں پر حق کا اظہار ہو چکا تو دوسرا حکم الہی آیا کہ اب جو کچھ آپؐ کو حکم دیا گیا ہے اسے سب کے سامنے برملا اور واشگاف انداز میں کہہ دیجئے۔ فَاصْدَعْ بِهَا تُؤْمِرُ (حجرات ۶) مکہ مکرمہ کے تمام لوگوں کے سامنے اسلام کا برملا اظہار کرنے کے لیے پہلا کام آپؐ نے یہ کیا کہ مسجد حرام پہنچ کر خانہ کعبہ کے سایے میں قریشی سرداروں کی مجلسوں کے سامنے آپؐ نے علانیہ نماز پڑھی۔ پہلے تو سب حیران رہ گئے۔ پھر جب آپؐ نے برابر نماز پڑھنی شروع کی تو ابو جہل مخزومی کی مذہبی عصیت بھڑک اٹھی اور اس نے آپؐ کو روکنا شروع کر دیا۔ دوسروں نے بھی روک ٹوک شروع کر دی مگر کوئی سد راہ نہ بن سکا۔ (سورہ علق ۱۹-۶، سورہ جن ۱۹)

ج۔ کوہ صفا سے دعوت عام:

علائیہ تبلیغ کافرینہ آپؐ نے اس طرح انجام دیا کہ ایک دن کو صفا پر چڑھ کر تمام قریش کے خانوادوں اور خاندانوں کو نام بنام لے کر پکارا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے ان کے سامنے فرمایا ”اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر ہے جو تم پر گھات لگا کر حملہ کرنا چاہتا ہے تو تم مان لو گے؟ لوگوں نے کہا: ہاں مان لیں گے کیوں کہ آپؐ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ آپؐ نے تب فرمایا کہ ”میں اللہ کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنے آپؐ کو اس کی پکڑ سے بچاؤ۔ تم ”لا الہ الا اللہ“ پر ایمان لاؤ میں اللہ کے ہاں تمہاری گواہی دوں گا۔ اگر تم اس کلمہ کو مان لو گے تو عرب و عجم تمہارے تابع ہو جائیں گے۔“

ابولہب نے اس موقع پر بھی اپنی اسلام دشمنی کے سبب لوگوں کو بہکایا اور کسی کو آپؐ کی بات سننے نہ دی۔ اگرچہ ابولہب آپؐ کا چچا تھا اور آپؐ سے بہت محبت کرتا رہا تھا مگر اسلام سے اسے سخت نفرت تھی اور اسی نفرت کے سبب اس نے ہمیشہ آپؐ کی مخالفت کی۔ وہ آپؐ کا اسلام کے لیے سب سے بڑا دشمن بنا اور اسلام کا شدید ترین مخالف۔ اس کی بیوی ام جہیل اموی بھی اسلام کی مخالف اور آپؐ کی دشمن بن گئی۔ قرآن مجید کی سورہ لہب میں ان دونوں کی اسی وجہ سے مذمت کی گئی ہے۔

د۔ علائیہ ادائیگی نماز:

علائیہ اعلان حق ہو چکا ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں نے بھی مسجد حرم میں نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اسلام کی جو خفیہ دعوت آپؐ اور آپؐ کے اصحاب نے تین سال تک دی تھی وہ سب نے اپنے اپنے حلقوں میں حکمت و خوبی کے ساتھ علائیہ پہنچانے پر کمر کس لی اور پورے انہماک سے دین پھیلانے لگے۔ آپؐ مسجد حرام میں قریش کی مجلسوں میں جاتے، گھروں میں ملاقات کرتے اور مکہ مکرمہ کے کونے کونے میں جاتے۔ ان کیساتھ مکہ کے قریب لگنے والے بازاروں عطاظ، مجنہ، ذوالجواز اور منی وغیرہ میں قبیلوں کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ سالانہ میلوں میں خاص کر باہر کے قبیلوں سے ملاقات کرتے

اور ان کو اللہ کا پیغام سناتے۔

اشاعت اسلام:

اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ قریشی خاندانوں میں تیزی سے اسلام پھیلنے لگا۔ دوسرا یہ کہ زائروں اور حاجیوں کے ذریعہ خاص کر اور تاجروں اور مسافروں کی بدولت عام طور پر اس کا چرچا عام ہوا اور اسلام کا شہرہ مکہ مکرمہ سے باہر مختلف علاقوں میں پھیل گیا۔ اسلام اور حق کے متلاشی مکہ آنے اور اسلام قبول کرنے لگے۔

مکہ مکرمہ کے باہر کے لوگوں میں جن حضرات نے اسلام قبول کیا ان میں حضرت ابوذر غفاری، حضرت عمرو بن عبسہ سلمی، حضرت ضامد بن ثعلبہ ازدی، حضرت عمرو بن طفیل دوسی / ازدی، اور حضرت طفیل بن عمرو دوسی، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت الہاشم عبدالقیسی وغیرہ بہت نمائندہ لوگ ہیں۔

یہ عرب کے مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیانی علاقہ میں بے دو قبلہ اسلم و غفار اسی زمانے میں اسلام سے روشناس ہوئے۔ یہ دونوں قبیلے قریب قریب پورے ہجرت سے قبل ہی مسلمان ہو گئے۔ جنوب کا علاقہ دوس سے لے کر یمن تک اسلام سے متاثر ہوا اور دوسرے بہت سے لوگ اسی زمانے میں مسلمان ہوئے۔ مشرق میں بحرین تک آپ کی آواز پہنچی اور مسلمانوں کی تعداد جلد ہی اتنی ہو گئی کہ انہوں نے نہ صرف مسجد بنالی بلکہ نماز جمعہ بھی ادا کرنی شروع کر دی۔ مدینہ منورہ کے شمال میں حضرت وحیہ بن خلیفہ کلبی جیسے مسلمانوں نے شامی سرحد کے قریب بسے ہوئے قبیلوں میں اسلام کا تعارف کرایا۔ بلاشبہ ہمارے راویوں کے تبصرہ میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اسلام کا آوازہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی عرب کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔

مخالفت حق

اسلام کے اظہار اور علانیہ تبلیغ کا تیسرا اہم نتیجہ قریشی سرداروں اور بہت سے عام لوگوں کی مخالفت کی شکل میں نکلا۔ پہلے تو انہوں نے زبانی لعن طعن، گالی گلوچ اور برا بھلا کہنے پر اکتفا کیا۔ بعض بڑے سرداروں نے اسلام سے استہزاء کرنا اور مسلمان کا مذاق اڑانا شروع کیا لیکن رفتہ رفتہ زبانی لعن طعن اور استہزاء کے ساتھ جسمانی اذیت دینے، مارنے پیٹنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابتداء میں معمولی تکلیف دہی کا کاروبار ہوا مگر جب مسلمانوں نے اسلام پر استقامت دکھائی اور اسلام پھیلتا رہا تو انہوں نے ظلم و ستم ڈھانے کی راہ اپنائی۔

قریش کی مخالفت اسلام اور مسلمانوں پر ان کے ظلم و ستم کے کئی اسباب تھے: سب سے اہم تو ان کی اپنے آبائی دین سے محبت و عقیدت تھی جس نے نئے دین کی مخالفت پر آمادہ کیا۔ یہ مذہبی عصبیت تھی۔ اس سے کچھ زیادہ اہم سبب یہ بھی تھا کہ اسلام کی وجہ سے ان کے خاندان بٹ گئے تھے۔ ہر خاندان میں کوئی نہ کوئی مسلمان ہو گیا تھا۔ خاندانوں کی یہ تقسیم ان کے قبائلی نظام کے کیلئے موت کی گھنٹی تھی۔ قریشی سرداروں نے خوب سمجھ لیا تھا کہ اسلام پورے نظام کو ختم کر کے اپنا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ جس میں دولت و اقتدار ان کے ہاتھ سے نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلا جائے گا۔ ایک سبب یہ تھا کہ آزاد منش لوگوں کی من زندگی پر اسلام پابندی لگاتا ہے جو انہیں قبول نہ تھی۔

مخالفت اسلام کے اثرات:

یہ عجیب بات تھی کہ اسلام کی جتنی مخالفت بڑھتی گئی اور مسلمانوں پر ظلم و ستم جس قدر شدید ہوتا گیا اسی قدر اسلام کی اشاعت میں تیزی آتی گئی۔ بنو امیہ کے خاندان سعیدی کے اک فرد حضرت خالد بن سعید پہلے اسلام لا چکے تھے۔ جب ان پر ظلم و ستم ہوا تو ان کے دو بھائی بھی مسلمان ہو گئے۔ دراصل مسلمانوں کی استقامت اور دین کے لیے مرٹنے کا جذبہ دوسروں کو متاثر کرتا تھا۔ پھر وہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش خلوص کے ساتھ کرتے اور مسلمان ہو جاتے۔

اس سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت اور پامردی بے مثال تھی۔ قریش کی ایذا رسانی اور مذاق اڑانے کے باوجود آپؐ برابر حرم میں نماز پڑھتے رہے، اور دشمنوں کے ہاتھوں عذاب سہتے رہے۔ آپؐ کا پڑوسی اور عزیز عقبہ بن ابی معیط اموی آپؐ کا بدترین دشمن تھا۔ کبھی وہ آپؐ کے گلے میں چادر ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا، کبھی سجدہ کی حالت میں آپؐ کی پشت مبارک پر اونٹ کی بھاری بھر کم اوجھڑی رکھ دیتا۔ دوسرا بڑھ ظالم اور دشمن ابو جہل مخزومی تھا جو آپؐ کو نماز میں اور نماز کے باہر ستانے اور پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔

آپؐ کے جذبہ استقامت نے حضرت ابوذر غفاری کو متاثر کیا انہوں نے قریش کے سرداروں کے مجمع کے سامنے حرم میں اپنے اسلام کا آغاز کیا اور خوب مار کھائی۔ حضرت عباس ہاشمی وغیرہ نے یہ کہہ کر بچایا کہ اگر یہ مر گیا تو تمہاری شامی تجارت کا راستہ سمجھو بند ہو گیا کیوں کہ اس کا قبیلہ اسی شاہراہ کے قریب آباد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی نے قرآن مجید کی بالجہر تلاوت مسجد حرام میں کی اور دشمنوں کے ہاتھوں خوب لہولہاں ہوئے۔

قریشی سرداروں اور عام مکی لوگوں کا معاملہ کچھ نفرت و محبت کا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر آپؐ کو اور دوسرے مسلمانوں کو نماز پڑھتے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے سنتے اور متاثر ہوتے۔ جی چاہتا کہ اسلام قبول کر لیں لیکن مصلحتیں آڑے آ جاتیں اور قبول حق اور اعلان ایمان سے رہ جاتے۔ ان قریشی سرداروں میں عتبہ بن ربیعہ عبد شمس، ابوسفیان اموی، ابو جہل مخزومی عقبہ بن ابی معیط، نضر بن حارث وغرہ کے علاوہ حضرت عمر بن خطاب عدوی بھی شامل تھے۔ حضرت عمر نے ایک بار خانہ کعبہ کے پردے میں چھپ کر آپؐ کی نماز میں تلاوت سنی تو بہت متاثر ہوئے

اور اسلام ان کے دل میں گھر کر گیا اور آپؐ کی واپسی پر آپؐ کا گھر تک پہنچا کیا اور اپنے تاثر کا اظہار بھی کیا۔

حضرت حمزہ کا قبول اسلام:

۵۰۶ نبوی/۱۶-۱۵ھ میں اسی ظلم و ستم کے سیلاب نے دو بڑی اور اہم شخصیتوں کو اسلام کا حلقہ بگوش کر دیا۔ ابو جہل مخزومی نے ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کا حلقہ بگوش کر دیا۔ ابو جہل مخزومی نے ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ستایا۔ آپؐ کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب ہاشمی، جو بہت بہادر اور صاحب جاہ تھے۔ شکار سے واپس آئے تو ان کی باندی نے اپنے چشم دید ماجرا کہہ سنایا۔ وہ طیش کے عالم میں مسجد حرام پہنچے، ابو جہل کو کمان مار کر زخمی کیا اور اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ بعد میں خدمت نبوی میں پہنچے اور صدق دل سے اسلام قبول کر لیا۔

حضرت عمر کا قبول اسلام:

اس کے ایک ماہ بعد قریشی سرداروں کے مجمع میں آپؐ کا ذکر ہو رہا تھا کہ آپؐ نے پورے مکہ کا حال تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب کی رگ حمیت ٹھہر کی اور وہ آپؐ کو قتل کر دینے کیلئے چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں ان کی ملاقات اپنے ایک عزیز عبد اللہ بن الحزام عدوی سے ہوئی جو مسلمان تھے۔ حضرت عمر کا ارادہ فاسد سن کر انہوں نے حضرت عمر کو ان کی اپنی بہن اور بہنوئی کے اسلام لانے کی خبر دی۔ بس غصہ کی باگ ادھر مڑ گئی۔ گھر پہنچ کر ان کو مارا پیٹا۔ بہن فاطمہ نے بڑے جذبہ سے جب یہ کہا کہ اب خواہ جان لے لو اسلام دل سے نہیں نکلتا تو بہت متاثر ہوئے۔ ان سے قرآن پاک کی وہ سورت نکلوا کر پڑھی جو وہ دونوں ان کے آنے سے پہلے پڑھ رہے تھے اور پڑھتے ہی مسلمان ہو گئے۔ دار ارقم پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح آپؐ کی وہ دعا قبول ہوئی جو آپؐ نے ان کے اسلام لانے کے بارے میں کی تھی۔

حضرت حمزہ اور خاص کر حضرت عمر کے اسلام لانے سے آپؐ کے ہاتھ بہت مضبوط

ہوئے اور مسلمانوں کو زبردست سہارا ملا۔ قریش کی مخالفت اتنی بڑھ گئی تھی کہ مسلمان مسجد حرام میں علانیہ نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان سے لڑ جھگڑ کر مسلمانوں کے لیے یہ حق حاصل کیا۔ حالانکہ اپنے اسلام کے لیے ان جیسے زبردست اور جنگ آدمی کو دشمنوں کی یورش کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ایک بڑے قریشی سردار عاص بن وائلؓ سہمی کی مداخلت اور حمایت سے ہی وہ بچ سکے تھے۔

مکی مواخاۃ:

اگرچہ قبائلی نظام حمایت کے سبب مسلمانوں کو اپنے اپنے خاندانوں کی حمایت حاصل تھی مگر وہ اپنے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں کے ہاتھوں ستائے جا رہے تھے۔ پھر دین کے اختلافات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو پورے سماجی تصورات میں تبدیلی آگئی تھی اور وہ اپنے خاندانوں اور عزیزوں کے درمیان ہی اپنے کو الگ تھلگ محسوس کرتے تھے۔ اس لیے جب ان کی خاصی تعداد ہوگئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں یگانگت و سماجی تنظیم پیدا کرنے کے لیے دودو کی مسلمانوں میں بھائی چارہ پیدا کیا۔ یہ پہلی اسلامی مواخاۃ تھی جو مکی عہد کی ہے۔ اس میں آپؐ نے قبیلہ اور خاندان کے تعلق، سماجی مرتبہ اور دینی مقام وغیرہ کی مصلحت کی رعایت رکھی۔ خود آپؐ حضرت علیؓ کے دینی بھائی بنے۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے مکی اور قریشی مسلمانوں میں سے دودو کو بھائی قرار دیا جو ہر طرح کے حقوق و فرائض رکھتے تھے۔

اسلامی بھائی چارہ خون کی رشتہ داری سے زیادہ گہرا اور دیر پا تھا۔ ان اسلامی بھائیوں نے تازندگی اس کا پاس و لحاظ رکھا۔ اس مکی مواخاۃ کے ذریعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ اور قریش کے درمیان مسلم معاشرہ اور اسلامی سماج کی تعمیر و تشکیل کی تھی جس طرح بعد میں مدنی دور میں مہاجرین و انصاری کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے ایک وسیع تر اسلامی معاشرہ پیدا کیا تھا۔ مکی مواخاۃ نے مختلف خاندانوں کے قریشیوں اور مکیوں کو خون کے رشتے کے مقابلے میں اسلامی رشتہ میں پرویا، ان میں یک جہتی اور یگانگت کا احساس پیدا کیا اور ایک

دوسرے کی مواسات و تعاون کا جذبہ بخشا۔ مکہ کے قریشی سماج کے بالمقابل یہ اولین اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل تھی۔

ہجرت حبشہ:

اللہ کی ایک سنت یہ رہی ہے کہ نبیوں اور رسولوں اور ان کے ماننے والوں کو اکثر اپنا وطن چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسمعیل، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور نہ جانے کتنے پیغمبروں کو اللہ کے لئے اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ جب مکہ مکرمہ کے قریشی سرداروں کا ظلم حد سے بڑھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ الہی کے مطابق مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی اس لیے تجویز رکھی کہ وہاں کا بادشاہ اگرچہ عیسائی تھا تاہم انصاف پسند اور رعایا پرور تھا۔ یقین تھا کہ مسلمان وہاں محفوظ اور خوش و خرم رہیں گے۔

۵۔ نبوی ۲۱۵ء میں پہلی بار رسولہ مسلمان ہجرت کر کے گئے۔ ان کے نام ہیں: حضرت عثمان بن عفان اموی اور ان کی بیوی حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عبد الرحمن بن عوف زہری، حضرت زبیر بن عوام اسدی، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ عبد شمس اور ان کی بیوی سہیلہ بنت سہیل عامری، حضرت مصعب بن عبدالدار عبد رباری، حضرت ابوسلمہ مخزومی اور ان کی اہلیہ اُم سلمہ بنت ابی امیہ مخزومی، حضرت عامر بن ربیعہ غزی اور ان کی بیوی حضرت لیلیٰ بنت ابی حمہ عامری، حضرت عثمان بن مظعون جمحی اور ان کی بیوی حضرت ام کلثوم بنت سہیل عامری، حضرت سہیل بن بیضاء فہری اور حضرت حاطب بن عمرو عامری۔ یہ سب قریش کے ممتاز خاندانوں کے جوان و شریف لوگ تھے۔ اس حقیقت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قریشی ظلم و ستم سے کوئی بھی نہیں بچا تھا۔ خواہ وہ اعلیٰ خاندان کے افراد ہوں یا کمزور خاندانوں کے امیر ہو یا غریب، ہر طرح کے مسلمان ظلم کی چکی میں پستے تھے۔ کمزور بے کس خاص کر غلام مسلمانوں میں سے کوئی ہجرت نہ کر سکا، کیوں کہ ان کو قریشی جال نے اپنے چنگل سے نکلنے ہی نہیں دیا۔ وہ غلامی کے بندھن میں ایسے بندھے تھے کہ جب تک ان کو کوئی آزاد نہ کراتا وہ اسی طرح بندھے رہتے۔

بعد میں چھپاسی اور لوگوں نے بھی حبشہ کو ہجرت کی۔ عام طور سے اسے دوسری ہجرت حبشہ کہا جاتا ہے اور یہ ۲۱ نبوی ۶۱۶ء میں ہوئی۔ اس میں تمام اہم خاندانوں کے ممتاز جوان مسلم شامل تھے۔ اس بار بھی مردوں، عورتوں دونوں نے ہجرت کی۔ ان میں حضرات جعفر بن ابی طالب ہاشمی، خالد بن سعید اموی، عمر بن سعید اموی وغیرہ کافی اہم لوگ شامل تھے۔

حضرت ابوبکر کا ارادہ ہجرت:

ظلم و ستم اتنا بڑھا کہ حضرت ابوبکر صدیق جیسے صاحب جاہ و مرتبہ شخص کو بھی ہجرت کا سفر اختیار کرنا پڑا مگر ان کو قبیلہ قارہ کا سردار ابن الدغنه راستے سے ہی اپنی پناہ میں واپسی مکہ لے آیا۔ وہ چند دنوں اس کی حمایت میں محفوظ رہے مگر جب وہ اپنے گھر کے صحن میں مسجد بنا کر نماز پڑھنے لگے تو قریشی سرداروں نے ابن الدغنه سے حضرت ابوبکر کی شکایت کی کہ ان کی تلاوت قرآن سے ان کے بیوی بچے متاثر ہوتے ہیں۔ ابن الدغنه نے حضرت ابوبکر کو زور سے تلاوت کرنے سے منع کیا مگر آپؐ نہ مانے بلکہ اس کی حمایت واپس کر دی۔

مہاجرین حبشہ کی جزوی واپسی:

کچھ دنوں کے بعد ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ النجم کی تلاوت کی اور آخر میں سجدہ کیا۔ اس وقت وہاں بہت سے مشرک بھی موجود تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا۔ اس سے یہ خبر اڑ گئی کہ مکہ والوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ حبشہ کے مسلمانوں نے یہ سنا تو خوشی خوشی واپس آ گئے لیکن جب ساحل سمندر پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش کے مسلمان ہونے کی خبر غلط ہے۔ متعدد لوگ تو پھر واپس حبشہ چلے گئے مگر زیادہ تر مسلمان چھپ چھپا کر مکہ آ گئے اور کسی نہ کسی سردار یا خاندان کی حمایت (جوار) میں رہنے لگے۔ ان کی جان کی حفاظت تو ہو گئی مگر تکلیف و ایذا سے نجات نہ ملی۔

قریشی مکہ کو کب گوارہ ہو سکتا تھا کہ وہ حبشہ میں مسلمانوں کو آزادی سے رہنے دیں انہوں نے ان کو بلانے کے لیے اپنا ایک وفد بھیجا مگر قریشیوں کو ساری تدبیریں اور سازشیں بیکار رہیں۔ حضرت جعفر کی تقریر سے حبشہ کا شاہ بخاشی (NAGUS) اتنا متاثر ہوا کہ اس نے

اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں کو مکہ واپس بھیجنے سے انکار کر دیا۔ مسلمان وہاں کئی برس تک بڑے امن و امان سے رہے۔

مسلمانوں کی تعذیب کی نوعیت:

قریشی سرداروں اور اسلام دشمنوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے ستائے جانے کا ذکر تو ملتا ہے مگر ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ انہوں نے قتل و غارتگری اور خونریزی سے گریز کیا تھا اس کا اصل سبب عربوں کا قبائلی نظام تھا۔ اس کے مطابق کوئی غیر قبیلہ شخص کسی دوسرے کو قتل یا زخمی نہیں کر سکتا تھا ورنہ اس کو دیت دینی پڑتی تھی یا قصاص خود قبیلہ اپنے کسی شخص کو قتل نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سخت بے عزتی اور بے غیرتی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو ان کے اپنے عزیز و اقارب اور قبیلہ والے ستاتے اور تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ پھر بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اسلام سے تو بے زار تھے مگر وہ ستانے اور مارنے کے حق میں نہ تھے۔ کچھ صرف مذاق اڑانے اور استہزا کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔ بس بے چارے کمزور مسلمانوں اور اجنبی (موالی یا حلفاء) کو ظلم کی چکی میں پستا پڑتا تھا کہ ان کے حامی و سرپرست ہی ان پر ظلم کرتے تھے۔ ایک عرب دستور یہ تھا کہ اگر کوئی کسی خاندان یا شخص سے پناہ (جوار) مانگتا تو اس سے انکار کرنا بے ہمتی اور بزدلی سمجھا جاتا تھا۔ جن مسلمان کو اپنے قبیلہ یا خاندان کی حمایت نہیں ملتی تھی وہ کسی نہ کسی سردار کی حمایت حاصل کر لیتے تھے یا سردار ان قریش اپنی شجاعت و بہادری کے سبب خود اپنی حمایت ان کو دیدیتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر حضرت عمر اور حبشہ کے مہاجرین کے معاملہ میں ہوا۔ اس لیے قتل و خونریزی کی وارداتیں کم ہوئیں۔

لیکن بعض شہادتیں بھی ہوئیں جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے میں آپ کے لے پالک اور سوتیلے فرزند حضرت حارث بن ابی ہالہ کافروں کے ایک زرعے میں شہید ہوئے یا طیش میں آکر ابو جہل مخزومی نے حضرت عمار بن یاسر کی ماں حضرت سمیہ کو برچھی ماری جس سے وہ شہید ہو گئیں۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچا ابوطالب اور ان کی وجہ سے بنو ہاشم اور بنو مطلب کی پکی حمایت حاصل تھی۔ اس لیے وہ آپ کو ایذا تو دے سکتے تھے مگر قتل نہیں کر سکتے تھے۔

سماجی مقاطعہ:

مگر کئی عرب سردار ایسے تھے جنہوں نے اسلام کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی تھی ان میں ابوہلب ہاشمی، ابو جہل مخزومی، ابوقیس بن فاکہ مخزومی، اسود بن عبدالاسد مخزومی، عقبہ بن ابی معیط اموی، اسود بن عبد یغوث زہری، حارث بن قیس سہمی، منہ بن حجاج سہمی اور اس کا بھائی نبیہ، امیہ بن خلف نجفی اور اس کا بھائی ابی وغیرہ بہت پیش پیش تھے۔

وہ عربوں کے اس روایتی اور مقدس قبائلی حمایت کے نظام کو توڑ ڈالنا چاہتے تھے۔ ان کا اصل نشانہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آپؐ کو ختم کر دیں تو سارا معاملہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس لیے انہوں نے کئی بار ابوطالب ہاشمی سے مطالبہ کیا کہ وہ آپؐ کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں یہاں تک انہوں نے تجویز رکھی کہ آپؐ کے بدلے کسی دوسرے عرب نوجوان کو لے لیں تاکہ دیت و قصاص کا مسئلہ نہ رہے ابوہلب ہاشمی نے چونکہ اس سے اتفاق اور رشتہ اور قبائلی روایت کی بھی پرواہ نہ کی تھی اس لیے سورۃ لہب میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔

عرب سرداروں اور اسلام دشمنوں نے اس نظام حمایت کو ختم کرنے کیلئے قریشی مجلس میں فیصلہ کر لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے حامی خاندانوں بنو ہاشم اور بنو مطلب کا سماجی مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائے۔ کوئی ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے۔ نہ شادی بیاہ کرے۔ نہ خرید و فروخت کرے۔ نہ ان کو کھانے پینے کا سامان دے جب تک وہ آپؐ کو قریش کے حوالے نہ کر دیں۔ اگرچہ اس فیصلہ سے بعض شریف النفس سردار متفق نہ تھے لیکن دشمنوں کے آگے وہ بھی کچھ نہ بول سکے کہ صورت حال یکسر ان کے خلاف تھی۔

ابوطالب تمام مسلمانوں اور بنو عبد مناف کے دونوں خاندانوں کو ساتھ لے کر بنو ہاشم کی ملکیت ایک گھاٹی شعب بنی ہاشم چلے گئے۔ ۶۱۶ء میں یہ محصوری اور مقاطعہ شروع ہوا اور تین سال ۶۱۹ء تک جاری رہا۔ مسلمانوں پر یہ زمانہ بہت سخت گذرا۔ اس دوران انہوں نے طرح طرح کی پریشانیاں جھیلیں۔ فاقے کیے۔ بھوکے رہے سوکھے پتے کھائے، چمڑا ابال کر بطور سالن کھایا لیکن اسلام نہیں چھوڑا بعض نیک لوگوں نے مسلمانوں کو چوری چھپے کھانے

پینے اور دوسری ضروریات کی چیزیں ابو جہل مخزومی جیسے لوگوں کے اعتراض کے باوجود پہنچائیں۔
ان میں حکیم بن حزام اسدی ابوالجتری اور ہشام عامری وغیرہ شامل تھے۔

مقاطعہ کا خاتمہ:

پھر انھیں نیک نہادوں خاص کر ہشام عامری، زبیر بن امیہ مخزومی، مطعم بن عدی نوفلی، ابولجتری اسدی، زمعہ بن اسود اسدی، عدی بن قیس سہمی اور عتبہ بن ربیعہ اموی/عبد شمس کی کوششوں سے مقاطعہ کا معاہدہ منسوخ ہوا اور مسلمان مع اپنے غیر مسلم حامیوں کے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ وہ ایک اور آزمائش سے سرخرو نکلے اور اسلام کو مزید استحکام ملا۔

وفات خدیجہ و ابوطالب:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپؐ لوگوں سے محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا ہے: وَلِلّٰهِ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ ۶۲) وہ سہاروں یا وسیلوں کا محتاج بھی نہیں۔ لیکن وہ اسباب کی دنیا میں کوئی نہ کوئی سبب پیدا کر دیتا ہے۔ سماجی مقاطعہ ختم ہوا ہی تھا کہ ۱۰ رمضان ۱۰ نبوی اپریل ۶۱۹ء میں حضرت خدیجہ کی وفات ہو گئی۔ ان کو مکہ کے حجون نامی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی قبر میں اترے اور اپنے دکھ سکھ کی ساتھی، زندگی کی رفیق اور مونس و غم خوار کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا۔

اس کے کچھ دن بعد اور بعض روایات میں ہے کہ کچھ دن پہلے آپؐ کے جاں نثار شفیق اور حامی چچا ابوطالب نے انتقال کیا۔ اگرچہ انہوں نے آخر تک اسلام قبول نہیں کیا اور اپنے آبائی دین پر مرے مگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے مددگار اور بکے حامی تھے۔ ان کی وفات کے وقت آپؐ نے پھر ان کو اسلام سے مشرف کرنے کی کوشش کی لیکن قریشی سرداروں نے ان کو عار دلایا۔ اور وہ آپؐ کی کوشش اور چاہت کے باوجود مسلمان نہیں ہوئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ آپؐ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔ ہدایت دینا صرف اللہ کا کام ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ رسول کا کام صرف تبلیغ کرنا اور اسلام پہنچانا ہے۔ (سورہ قصص ۵۶ اور سورہ آل عمران ۲۰ اور سورہ مائدہ ۹۲، ۹۹ وغیرہ)

خاندانی حمایت سے محرومی:

ان دونوں زبردست حامیوں اور مددگاروں کی وفات کے سبب آپؐ ان کی حمایت سے محروم ہو گئے۔ مگر اس سے زیادہ آپؐ کو ان کی وفات کا غم تھا۔ اس لیے آپؐ اس سال کو غم کا سال (عام الحزن) کہا کرتے تھے۔

ابوطالب ہاشمی کے انتقال کے بعد ابولہب ہاشمی بنو ہاشم کا سردار بن گیا۔ شروع میں اس نے آپؐ کی حمایت قبائلی روایت کے مطابق کی اور اپنی اسلام دشمنی کے باوجود کی مگر جلد ہی اس پر دشمنی غالب آگئی اور اس نے آپؐ کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیا۔

قریشی سرداروں اور اسلام دشمنوں نے دیکھا تو ان کی جراتیں بڑھ گئیں۔ انہوں نے آپؐ کو ستانے کی رفتار تیز کر دی کبھی آپؐ کی راہ میں کانٹے اور روڑے بچھاتے، کبھی گندگی پھیلاتے، کبھی آپؐ کے سر اقدس پر خاک ڈالتے، کبھی نماز میں سجدہ کی حالت میں پیٹھ پر اوجھڑی رکھ دیتے۔ کبھی گلے میں چادر کا پھندا ڈال کر گردن گھونٹتے اور یہ صرف اس لئے تھا کہ آپؐ کہتے تھے کہ اللہ میرا رب ہے اور لوگوں کو اسی کی طرف بلاتے تھے (سورہ عافر ۲۸) کئی بار حضرت ابوبکر صدیق اور آپؐ کی کم دختر فاطمہ نے اس قسم کی تکلیفوں سے آپؐ کو بچایا۔

نکاح ثانی و ثالث:

حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آپؐ کی دو کم سن بچیاں حضرت ام کلثوم (عمر تقریباً سولہ سال) اور حضرت فاطمہ (عمر دس سال) رہ گئی تھیں۔ ماں کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد ان کی اور بعض دوسرے بچوں بچیوں کی دیکھ بھال کرنیوالا کوئی نہ تھا بعض خیر خواہوں کے مشورہ اور کوشش سے آپؐ نے پہلے حضرت سودہ بنت زمعہ عامری سے نکاح کر لیا۔ وہ بیوہ تھیں اور ان کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ ان کے سابق شوہر سکران بن عمرو عامری کا حبشہ میں ہجرت کے دوران انتقال ہو گیا تھا اور وہ مکہ لوٹ آئی تھیں نکاح کے بعد انہوں نے آپؐ کے گھر کا انتظام سنبھال لیا اور آپؐ کو کافی راحت ملی۔

حضرت ابوبکر اور ان کے خاندان سے تعلق مضبوط کرنے کے اور بعض دوسری اسلامی

مصلحتوں سے آپؐ نے انھیں خیر خواہوں کے مشورہ پر ان کی کم سن بیٹی حضرت عائشہ سے تیسرا نکاح کر لیا۔ اس وقت ان کی عمر چھ سال تھی اس لیے ان کی رخصتی نہیں ہوئی۔ یہ دونوں نکاح یکے بعد دیگرے شوال ۱۰ء نبوی ۶۱۹ء میں ہوئے۔

طائف کا سفر:

خانگی معاملات کی مشکل اور تبلیغی مسائل کی دشواری کے باوجود آپؐ برابر اپنے فرائض رسالت ادا کرتے رہے۔ ہر سال آپؐ باہری قبیلوں کے سامنے اسلام پیش کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں آپؐ نے عکاظ، مجنہ، ذوالجواز اور منی وغیرہ قریبی شہروں اور بازاروں کے سفر کیے۔ قبیلوں کے سامنے اسلام پیش کرنے کی اگلی کڑی طائف کا سفر تھا جو آپؐ نے شوال ۱۰ء نبوی ۶۱۹ء ہی میں کیا۔ آپؐ کے ساتھ حضرت زید بن حارثہ بھی تھے۔ یہ سفر مکہ مکرمہ سے مایوس ہونے یا قریشیوں کے ظلم سے تنگ آنے کے سبب نہیں کیا تھا بلکہ وہ آپؐ کے ملکی تبلیغی مشن کا ایک حصہ تھا۔ وہاں آپؐ نے ایک ماہ تک قیام کیا۔ اس کے سرداروں خاص کر تین ثقفی شیوخ عبد یلیل، مسعود اور حبیب کے سامنے اسلام پیش کیا۔ لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ آپؐ نے پھر طائف کے عوام کے سامنے اسلام کی تبلیغ کی اور مہینہ بھر کوشش کرتے رہے۔ سرداروں کو خوف ہوا کہ کہیں آپؐ کامیاب نہ ہو جائیں۔ لہذا آپؐ کو شہر سے نہ صرف نکال دیا بلکہ اوباشوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا جنہوں نے پتھر مار مار کر آپؐ کو اتنا زخمی کیا کہ خون سے جوتے بھر گئے۔ فرشتوں نے آکر آپؐ سے بددعا کیلئے کہا مگر آپؐ سر اپارحمت تھے لہذا ان کے لئے دعا ہی کی۔ واپسی میں عتبہ اور شیبہ کے باغ میں قیام کیا جہاں ان کا عیسائی غلام عداس مسلمان ہو گیا۔ اسی مقام سے آپؐ نے حضرت زید بن حارثہ کو بنو نوفل کے سردار مطعم بن عدی کے پاس (جو آپؐ کے چچا تھے) بھیجا اور ان سے جوار (پناہ) طلب کی مطعم خاندان بنو عبد مناف کے ایک فرد تھے۔ انہوں نے آپؐ کو اپنی جوار دے دی اور مسجد حرام میں جا کر اس کا اعلان کر دیا اس کا سب نے احترام کیا۔ مکہ مکرمہ میں اپنے قیام کا باقی زمانہ آپؐ نے ان ہی کے جوار میں گزارا اور اسی کے سایہ اور حفاظت میں قبیلوں سے ملتے رہے اور اسلام کی دعوت دیتے رہے۔

اسراء و معراج:

طائف کے سفر سے واپسی پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کا رتبہ بلند کرنے اور اسلام کے ایک رکن کی تکمیل کیلئے آپؐ کو اسراء و معراج کی نعمتوں سے نوازا۔ قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ راتوں رات آپؐ کو مسجد حرام سے بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ تک اپنی آیات اور بابرکات زمین دکھانے لے گیا۔ اس کو اسراء کہتے ہیں۔ وہاں آپؐ کو آسمانوں کی سیر کرائی اور سدرة المنتہی نامی بلند مقام تک آپؐ کو عروج بخشا۔ اسی سفر میں رات دن کی پانچ نمازیں..... فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء..... فرض ہوئیں معراج کا ذکر سورہ نجم میں ہے اور اسراء و معراج کا مفصل بیان حدیث کی کتابوں میں ہے آپؐ کے یہ دونوں سفر جسمانی تھے یعنی اپنے مادی جسم کے ساتھ آپؐ گئے تھے۔ صرف روحانی تجربہ جیسے کشف و خواب نہ تھا۔

قبائلی عرب سے خاص ملاقاتیں:

شروع ہی سے آپؐ عرب قبیلوں کے سامنے اسلام پیش کرتے رہے تھے۔ اب آپؐ نے ان سے اپنی حمایت کرنے اور اپنے علاقے میں پناہ دینے کا مطالبہ بھی شروع کر دیا کیونکہ آپؐ کی ہجرت کا وقت آرہا تھا اور قریش و ثقیف وغیرہ سے حمایت و نصرت کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ اس سلسلہ میں آپؐ نے بنو کنندہ، بنو کعب، بنو بکر بن وائل، بنو عامر بن صعصہ، بنو شیبان، بنو تمیم اور ان کی شاخ، بنو الحارث بن کعب، بنو حنیفہ، بنو سلیم، بنو عبس، بنو عذرہ، بنو غسان، بنو فزازہ، بنو محارب بن حصفہ وغیرہ تمام بڑے قبائل سے ملاقات کر کے ان کے سامنے اپنی دعوت اور اپنا مطالبہ رکھا مگر کسی نے آپؐ کی بات پر کان نہ دھرا۔ سنا تو اپنی شرائط رکھیں جو آپؐ کو منظور نہ ہوئیں۔

قبائل مدینہ سے ملاقات:

انہیں دوروں اور سالانہ ملاقاتوں میں آپؐ مدینہ منورہ کے قبیلوں اور افراد سے ملتے رہے تھے۔ ان کے حاجی اور زائر بھی مکہ آتے رہتے تھے اور آپؐ کے پیغام سے واقف ہوتے رہتے تھے۔ مگر چند افراد کے سوا کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔ ان میں پہلے سوید بن صامت تھے جو متاثر ہوئے مگر وہ اسلام لانے سے قبل مدینہ کی اوس و خزرج کی جنگ بعاث ۶۱۵ء میں مارے

گئے۔ ایک اور مدنی وفد کے رکن ایاس بن معاذ بھی اسلام سے متاثر ہوئے تھے اور غالباً مرنے سے قبل مسلم ہو گئے تھے۔

مگر اصل سعادت مدینہ کے دو نیک نہاد افراد حضرت اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد قیس کے حصہ میں آئی جو آپؐ سے مکہ میں ملے اور مسلمان ہو گئے اور مدینہ واپس جا کر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ کم از کم ایک شخص حضرت ابوالہیثم بن الہیثم نے ان کی دعوت پر اسلام قبول کر لیا بعد میں اور لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا۔

پہلی بیعت عقبہ

۱۱۔ نبوی ﷺ میں حج کے زمانہ میں مدینہ کا جو وفد مکہ آیا اس کے چھ ارکان نے جو سب کے سب خزرج کے قبیلہ سے تھے، آپؐ سے ملاقات کی۔ ان میں سے کچھ پہلے مسلمان ہو چکے تھے اور کچھ نے اس موقع پر اسلام قبول کر لیا۔ انہوں نے مدینہ واپس جا کر لوگوں میں اسلام پھیلانا شروع کیا اور کافی لوگ مسلمان ہو گئے۔

اگلے سال ۱۲۔ نبوی ﷺ میں مدنی مسلمانوں میں سے بارہ لوگوں نے آپؐ سے حج کے زمانے میں ملاقات کی۔ ان میں سے تین اوس کے اور چھ خزرج کے تھے۔ انہوں نے آپؐ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کو جو بیعت نساء (عورتوں کی بیعت) کہلاتی ہے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ چوری، زنا، اولاد کے قتل، الزام لگانے اور بہتان تراشنے اور ہر اچھے کام میں آپؐ کی مخالفت کرنے سے بچیں گے۔ آپؐ نے ان کی درخواست پر حضرت مصعب بن عمیر عبدری کو مدینہ میں اپنا نمائندہ اور ان کا معلم بنا کر بھیجا۔ ان کی تبلیغ و تعلیم اور کوشش سے مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پہنچ گیا۔ اوس و خزرج دونوں عرب قبیلوں کے سرداروں سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ نے اسلام قبول کر لیا اور ان کے اثر سے پورے قبیلے مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے پہلی بار مدینہ میں جمعہ کی نماز قائم کی۔

دوسری بیعت عقبہ:

ذوالحجہ ۱۳۔ نبوی ﷺ جون جولائی ۶۲۲ء میں مدینہ کے مسلمانوں کا ایک بڑا وفد جس میں

کچھتر مرد اور دو عورتیں بھی شامل تھیں آپؐ سے مکہ کی گھاٹی میں ملا۔ اس نے آپؐ سے جنگ و امن کا معاہدہ کیا اور آپؐ کو اور مکی مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ دینے اور اپنے بیوی بچوں کی طرح ان کی حفاظت کرنے کا عہد کیا۔ یہ دراصل ساری دنیا سے جنگ کرنے کا معاہدہ تھا۔ اسی لیے اس کو بیعت الحرب کہتے ہیں۔ آپؐ نے اپنے بارہ نمائندے مقرر کیے جن کو نقیب کہا جاتا ہے۔ ان میں نو خزر ج کے مختلف خاندانوں سے تھے اور تین اوس کے خاندان سے۔ حضرت اسد بن زرارہ ان کے سردار اور نقیب خاندانوں انقباء تھے۔ اس بیعت کے بعد مدینہ منورہ میں اسلام اور تیزی سے پھیلنے لگا اور گھر گھر میں پہنچ گیا۔ بلکہ بیشتر آبادی مسلمان ہو گئی یہی بیعت ہجرت مدینہ کا دیباچہ بن گئی۔

تیرہ سالہ مکی عہد کا تجزیہ:

دوسری بیعت عقبہ کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا مکی عہد تقریباً اختتام کو پہنچا۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد ہی مدنی عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ مکی دور مجموعی طور سے لگ بھگ تریپن سال ۱۷ھ-۶۲۲ھ پر مشتمل ہے۔ اس میں سے چالیس سال کی مدت (۱۷ھ-۶۱۰ھ) نبوت محمدی سے پہلے کا زمانہ ہے اور تیرہ سال نبوی دور یا بعثت کے بعد کا عہد ہے۔ یہی تیرہ سال دور اسلام کا مکی عہد ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے مکی دور کا ایک جامع تجزیہ کر لیا جائے۔ پھر مدنی دور پر بحث کی جائے۔ اس سے اسلام کے ارتقاء اور اسلامی تاریخ کے اس اہم دور کی امتیازی خصوصیات معلوم ہوں گی۔

۱۔ یہ کہ آپؐ کی نبوت کا آغاز ۱۲ ربیع الاول ۳۱ھ عام الفیل میں سچے خوابوں کے دیکھنے سے ہوا اور اس کے چھ ماہ بعد رمضان کی شب قدر میں پہلی بار غار خرا میں قرآن مجید نازل ہوا

۲۔ آپؐ کو اپنی نبوت و رسالت کا روز اول سے ہی یقین تھا۔ اسی طرح حضرت خدیجہ کو یقین تھا۔ حضرت خدیجہ اور حضرت ورقہ کی تصدیق سے آپؐ کو تسلی ملی۔

۳۔ قرآن کے پہلے نزول کے بعد کچھ دنوں تک اس کا نازل ہونا بند رہا تا کہ آپؐ کا دل مضبوط اور کلام الہی کا بارگراں اٹھانے کے قابل ہو جائے۔ اس کو فترۂ وحی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

۴۔ چالیس دن کے فترہ کے بعد سورہ مدثر نازل ہوئی جس میں آپؐ کو حکم دیا گیا کہ لوگوں کو اللہ کے دین سے باخبر کریں۔ یہاں سے تبلیغ کا دور شروع ہوا۔

۵۔ تبلیغ کا یہ دور خفیہ کہلاتا ہے۔ کیوں کہ ابھی علانیہ اور کھلم کھلا تبلیغ کا حکم الہی نہ تھا۔ قرآن مجید کا نزول برابر جاری رہا اور کبھی بند نہ ہوا۔

۶۔ اس دور میں اسلام کے تین عقیدے سکھائے گئے: توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان۔ ان کے ساتھ جنت و جہنم، تقدیر، کتابوں اور فرشتوں وغیرہ پر ایمان لانے کے ذیلی عقیدے بھی شامل تھے۔ اسلام کے ارکان میں پہلے صرف وضو اور دن میں ایک نماز کی تعلیم دی گئی۔ اس کے علاوہ کئی اخلاقی تعلیمات دی گئیں جیسے سچ بولنا، امانت ادا کرنا، وعدہ اور معاہدہ کی پابندی کرنا اور مسلمانوں کی مدد کرنا وغیرہ۔

۷۔ خفیہ تبلیغ کے تین سالہ دور (۳۱۰ء) میں قریش کے تمام خاندانوں میں اسلام پھیلا۔ ان میں شریف خاندانوں کے لوگ بھی تھے اور غلام و کنیز اور کمزور مسلمان بھی۔

۸۔ زیادہ تر مسلمان نوجوان تھے۔ ان کی تعداد کئی سو تھی۔ مکہ کے باہر بسے ہوئے قبائل کے لوگ بھی اسلام لائے۔

۹۔ تین سال پورے ہونے سے قبل دار ارقم اسلام کا پہلا مرکز بنا جہاں اسلام کی عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل قیام اس مرکز میں رہتا تھا۔

۱۰۔ ۶۱۳ء میں علانیہ تبلیغ کا دور اللہ کے حکم سے شروع ہوا جو باقی دس سال تک جاری رہا۔ اس دور میں بہت سے اہم واقعات پیش آئے۔

.....مسلمانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ ان میں نکی قریشی لوگ بھی شامل تھے اور باہری بدوی قبیلوں کے لوگ بھی۔ مردوں عورتوں اور بچوں نے الگ الگ اور پورے خاندانوں نے اسلام قبول کیا۔

.....مسلمانوں کی خاصی تعداد ہونے کے بعد ان میں مواخاۃ (بھائی چارہ) پیدا کیا گیا اور پہلی بار اسلامی معاشرہ کی تشکیل ہوئی جس کی بنیاد خون کے رشتے کے بجائے اسلام پر رکھی گئی۔

.....تاجروں، مکہ کے زائروں، حاجیوں اور عرب قبیلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوزوں نے پورے عرب میں اسلام کا تعارف کرا دیا۔

.....اسی دور میں مکہ کے قرب و جوار بلکہ دور دراز کے علاقوں میں بھی اسلام پھیلا۔ ان میں جنوبی عرب کے قبیلے اور علاقے یمن وزبید و دوس وغیرہ، مشرق میں بحرین کے عبدالقیس، مغرب میں اسلم و غفار وغیرہ کے قبیلے شامل تھے۔

.....اسی زمانے میں اسلام کی مخالفت قریش کے طرف سے شروع ہوئی۔ اس میں تقریباً سب قبیلے شامل تھے۔ پہلے زبانی ملامت ہوئی پھر مار پیٹ ہوئی اور جسمانی تکلیفیں دی گئیں۔
.....قریشی معزز خاندانوں کے مسلمانوں کو نسبتاً کم تکلیف کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کے خاندانوں کی حمایت انہیں حاصل تھی مگر کمزور مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔
.....مکی سرداروں کے ظلم و ستم سے بچنے کیلئے سوڈیڑھ سو مسلمان حبشہ ہجرت کر گئے بعد میں بہت سے لوگ واپس مکہ آ گئے مگر زیادہ تر وہیں نجاشی کی حمایت میں مقیم رہے۔

.....دور قریشی اکابر حضرت حمزہ ہاشمی اور حضرت عمر عدوی کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بہت تقویت ملی اور علانیہ اسلام پر عمل کرنے لگے۔

.....قریشی دشمنوں نے قبائلی نظام حمایت توڑنے کے لئے مسلمانوں کا سماجی بائیکاٹ کیا جو تین سال (۶۱۶ء) جاری رہا مگر وہ مسلمانوں کے صبر و استقلال کے آگے دم توڑ گیا۔
خود قریشی سرداروں نے اس کو ختم کر دیا

.....۹۔ نبوی ۶۱۹ء میں آپ کے دو قریب ترین حامیوں حضرت خدیجہ اور ابوطالب ہاشمی کی وفات ہوئی اور آپ خاندان بنو ہاشم کی حمایت سے محروم ہو گئے۔

.....قبائل میں تبلیغی دوروں اور وقتی کوششوں کے سلسلے میں ۶۱۹ء میں طائف کا سفر کیا جہاں ایک ماہ تک تبلیغ کرتے رہے مگر سرداروں کی مخالفت سے کامیابی نہیں ملی البتہ اسلام کا تعارف خوف ہو گیا۔

.....قبیلوں کو اسلام کی دعوت دینے کے سلسلہ میں مدینہ کے سرداروں سے ملاقات ہوئی ۶۱۵ء کے لگ بھگ مدینہ منورہ میں اسلام کا تعارف ہوا۔

.....۶۲۰ء سے چھ خزرجیوں کے قبول اسلام اور اشاعت دین سے مدینہ منورہ میں اسلام کا عاصرحرچہ چاہوا۔

.....۶۲۱ء میں مدنی مسلموں کے نو نمائندوں سے بیعت نساء ہوئی جو اخلاقی تعلیمات پر مبنی تھی۔ اس سے اسلام کا کام اور بڑھا۔

.....۶۲۲ء میں مدنی مسلمانوں کے ستھتر نمائندوں سے بیعت حرب ہوئی اور مدینہ کی اکثریت اسلام سے مشرف ہو گئی۔

.....بیعت حرب ہی ہجرت مدینہ کا دیباچہ بن گئی۔

حیات نبوی کا دوسرا دور

مدنی عہد ۱ھ:

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کرنے کے ساتھ اسلامی تاریخ کا مدنی دور شروع ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ہجرت کرنے کی اجازت بیعت حرب یا دوسری عقبہ کی بیعت کے بعد مل گئی اور مسلمانوں نے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اور اکادکا ترک وطن کرنا شروع کر دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اجازت الہی ملنے کے منتظر رہے۔ اور جوں ہی اجازت ملی آپؐ بھی مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی سے مدنی حیات طیبہ کا دور شروع ہوتا ہے جو دس سال کے عرصہ پر محیط ہے یعنی ۱۲ ربیع الاول ۱ھ ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء سے لے کر ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ ۸ جون ۶۳۲ء تک۔

آسانی کی خاطر اور بعض بنیادی فرق کے سبب اس دس سالہ عہد کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں اول ۲-۱ھ ۲۴-۶۲۲ء میں تقریباً اٹھارہ ماہ کا زمانہ جو ہجرت نبوی جنگ بدر تک وسیع ہے یہ ابتدائی مدنی دور ہے۔ دوسرا ۵-۲ھ ۲۸-۶۲۴ء کا دور ہے جو قریشی حملوں کا زمانہ ہے اور جنگ بدر سے جنگ خندق تک کا ہے۔ تیسرا ۸-۶ھ ۳۰-۶۲۸ء کا دور ہے جو خندق اور فتح مکہ کے درمیان کا عہد ہے۔ اور چوتھا ۱۱-۹ھ ۳۲-۶۳۰ء کا تقریباً سوا دو سال کا عرصہ ہے۔ جو فتح مکہ سے آپؐ کی وفات حسرت آیات تک وسیع ہے۔ ان تمام ادوار کی الگ الگ خصوصیات ہیں جو ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔

پہلامدنی دور ۲-۱ھ / ۶۲۲-۶۲۳ء:

اس دور کا آغاز ہجرت سے ہوتا ہے۔ ہجرت مدینہ کے سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے خواب میں دکھایا گیا کہ آپؐ کا دارالہجرتہ ایک ہرا بھر نخلستان ہے۔ آپؐ کو خیال ہوا کہ شاید وہ یمامہ یا ہجر علاقہ ہے لیکن وحی الہی نے وضاحت کر دی کہ ہجرت کا موعہدہ گھر یثرب ہے جو بعد میں مدینہ کے نام سے مشہور ہوا۔ بیعت عقبہ ثانیہ سے اس کی عملی تصدیق ہو گئی اس وقت تک یثرب یا مدینہ تقریباً پورا کا پورا مسلم بن چکا تھا۔ اس کی غالب اکثریت کے مسلمان ہونے سے اسلام، مسلمانوں اور آپؐ کو وہ حمایت و نصرت از خود حاصل ہو گئی تھی جس کی آپؐ کو اسلام کے لئے تلاش تھی۔ دراصل مدینہ منورہ کو آپؐ کا دارالہجرت بنانا اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت عملی اور مصلحت کا مظہر تھا۔ اول تو یہی چیز تھی کہ دارالہجرتہ کی اکثریت مسلمان تھی۔

دوسرے مدینہ منورہ مکہ مکرمہ کے حلقہ اثر سے دور بھی تھا اور مرکزی عرب میں بھی واقع تھا جب کہ دوسرے مقامات بہت دور تھے اور ان کا قریش، مکہ اور بیت اللہ سے براہ راست ربط نہ تھا۔ تیسرے مدینہ منورہ اس بین الاقوامی شاہراہ تجارت پر واقع تھا جو مکہ کے ایک طرف یمن سے (جنوب میں) اور دوسری طرف شام سے (شمال میں) جوڑتی تھی۔ قریش مکہ سے جلد یا بدیر آویزش لازمی تھی۔ لہذا مدینہ قریش پر تجارتی دباؤ بھی ڈال سکتا تھا اور ان کی فوجی ناکہ بندی بھی کر سکتا تھا۔

چوتھے مدینہ منورہ کے اوس و خزرج کے دو عرب قبیلے، جو انصار تھے، مالی لحاظ سے آسودہ تھے۔ وہ زراعت کرتے تھے اور کچھ تجارت پیشہ بھی تھے۔ مہاجرین مکہ وہاں مختلف اقتصادی مشاغل اختیار کر کے معاشی لحاظ سے مستحکم ہو سکتے تھے۔ وہ اپنی پسند کا اسلامی سماج قائم کر سکتے تھے۔ اور اسلامی تہذیب کو فروغ دے سکتے تھے۔

پانچویں مدینہ منورہ بحر قلزم کے بہت قریب تھا۔ لہذا وہ ایک اہم فوجی مرکز بھی بہ آسانی بن سکتا تھا۔ وہ تنگ مغربی ساحل پر قبضہ کر کے فوجی طاقت بن سکتا تھا۔ اور جیسا کہ بعد میں ہوا بھی۔ چھٹے یہ کہ مدینہ اور اس کے ارد گرد کے علاقے مکی سیاست کے اثرات سے آزاد تھے۔

مسلمان قرب و جوار کے عرب قبیلوں سے اتحاد کر کے ایک ریاست اسلامی کی بنیاد رکھ سکتے تھے ساتویں یہ کہ وہ آزادی سے اللہ کے دین پر عمل کر سکتے تھے اور اس کے مطابق زندگی کا نظام مرتب کر سکتے تھے۔

ہجرت کا آغاز:

دوسری بیعت عقبہ کے بعد ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مدینہ منورہ ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ پہلے اکادکا کر کے مکی مسلمان جاتے رہے۔ اور زیادہ تر چھپ چھپا کر۔ کیونکہ قریشی سرداروں اور اسلام دشمنوں کو مدینہ میں اسلام کی اشاعت کی خبر مل چکی تھی۔ اور ہجرت حبشہ وغیرہ سے ان کو بیعت عقبہ کی اہمیت کا کچھ اندازہ بھی ہو چکا تھا۔ پھر وہ بڑے سمجھ دار اور تجربہ کار لوگ تھے اس لیے مسلمان جانتے تھے کہ وہ آسانی سے ان کو مدینہ ہجرت کرنے نہ دیں گے اور ہوا بھی یہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد اور دودھ شریک بھائی حضرت ابوسلمہ مخزومی اپنے خاندان بنو مخزوم کے ایک ممتاز فرد تھے۔ وہ پہلے ہجرت کرنے والوں میں سرفہرست ہیں۔ جب وہ اپنی بیوی حضرت امہ سلمہ اور چھوٹے بچے سلمہ کے ساتھ مدینہ جانے لگے تو خود ان کی بیوی کے خاندان بنو مغیرہ بنو مخزوم نے حضرت ام سلمہ اور بچے کو نہ جانے دیا اور وہ مجبوراً حضرت ابوسلمہ اکیلے ہی ہجرت کر گئے۔ حضرت ام سلمہ اپنے بچے کے ساتھ ایک سال کے بعد بنو عبدالدار کے ایک شریف آدمی عثمان بن طلحہ عبدری کی مہربانی سے مدینہ ہجرت کر سکیں۔

ہجرت مدینہ کی عام اجازت ملتے ہی دوسرے مسلمانوں نے ہجرت کرنی شروع کی۔ سب سے پہلے جانے والوں میں حضرت ربیعہ بن عامر عنزی اور ان کی اہلیہ لیلیٰ بنت ابی حمہ، حضرت عثمان بن عفان اموی اور ان کی اہلیہ حضرت رقیہ بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ شامل تھے۔ عام طور سے یہ سب انفرادی طور سے ہجرت کرنے والے تھے۔

مسلم گروہوں کی ہجرت:

جو لوگ نسبتاً طاقتور اور مالدار تھے انہوں نے پورے خاندانوں اور گروہوں کے ساتھ

علائیہ ہجرت کی تھی۔ ان میں بنو اسد خزیمہ کا ایک خاندان بنی غنم بن دودان، جس کے سربراہ حضرت عبداللہ بن جحش تھے، اپنے چالیس مردوں و عورتوں کے ساتھ مدینہ گیا۔ جانے سے پہلے انہوں نے اپنے مکانوں کو تالا لگا دیا۔ اور سارا سامان و اسباب اور نقدی ساتھ لے گئے۔ دوسرا بنو مظعون (حضرت عثمان بن مظعونؓ کی کا خاندان) تھا۔ تیسرا بنو بکیر کا۔ ان سب میں متعدد افراد گروہ اور جماعت بنا کر گئے تھے۔ حضرت عمر بن خطابؓ عدوی کا قافلہ ہجرت بھی ہیں افراد پر مشتمل تھا۔ وہ اپنی ساری دولت اور اسباب بھی لے گئے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے خاندان اور گروہوں نے اجتماعی طور پر ہجرت کی تھی۔

خفیہ اور انفرادی ہجرت:

کمزور مسلمانوں کو چھپ چھا کر اکادکا جانا پڑا تھا کہ ان کی حمایت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ روک ٹوک کرنے اور لوٹنے والے بہت تھے۔ اس قسم کے مسلمان مہاجرین میں حضرت مصیب بن سنان رومی تھے جن کا سارا مال قریش نے دھروا لیا تھا۔ وہ خوش خوش نفع کا سودا کر کے مدینہ سدھارے۔ حضرت خباب بن الارتؓ تیسری لوہاری کا کام کرتے تھے۔ ان کا مکہ کے کئی سرداروں پر مال ادھار تھا۔ کسی نے ان کا ادھار نہیں دیا۔ وہ سب چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔ ان جیسے متعدد افراد تھے جنہوں نے اپنا مال اللہ کی راہ میں چھوڑ دیا اور ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

مہاجرین کے تین طبقات:

حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتصادی لحاظ سے مہاجرین کے تین گروہ تھے: ایک وہ جو بالکل خالی ہاتھ مدینہ پہنچے۔ دوسرے وہ جو کچھ بچا کچھا کر سامان اور نقدی کی شکل میں لے جاسکے اور تیسرے وہ جو اپنا تمام غیر منقولہ مال و اسباب لے گئے۔ ظاہر ہے کہ مکانات اور جائیدادیں سب مکہ میں رہ گئیں۔ مالی نقصان اور غریب الوطنی کی مصیبت کچھ کم نہ تھی مگر ان مہاجرین نے اللہ کی راہ میں اور اس کی رضا کے لئے خوشی خوشی برداشت کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق مہاجرین کو اپنے انعامات سے خوب نوازا۔ (سورہ نساء ۱۰۰)

مکہ کے بیکس مسلمان:

بہت سے ایسے تھے جو اپنے عزیزوں، بزرگوں اور قریشی سرداروں کی دشمنی کی وجہ سے جانہ سکے یا اگر چلے گئے تھے تو بہانہ اور مکر و فریب سے واپس لا کر مکہ میں قید کر دیئے گئے۔ ابو جہل مخزومی اپنے مال جائے بھائی حضرت عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی کو ماں کی بیماری اور پریشانی کا فریب دے کر مدینہ سے باہر لایا اور راستہ میں قید کر کے مکہ لے جا کر بند کر دیا۔ حضرت ہشام بن عاص سہمی کو ان کے عزیزوں نے مکہ ہی میں پکڑ کر خانہ قید کر دیا۔ اس طرح سہیل عامری نے اپنے بیٹے حضرت ابو جندل کو گھر میں مدتوں بند رکھا۔ ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن سہیل عام بھی اسی طرح پکڑ کر بند کر دیئے گئے۔ ان پر طرح طرح کے ظلم و ستم کئے گئے۔ مکہ مکرمہ میں ایسے مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی۔

مکی مسلمانوں میں دو طرح کے لوگ تھے جنہوں نے اسلام لانے کے بعد ہجرت نہیں کی۔ حالانکہ سب کو ہجرت کا حکم تھا۔ ان کے اس کام کو اللہ اور رسول نے پسند نہیں فرمایا۔ دوسرے وہ لوگ تھے جن کو قریش نے خوشی سے مکہ مکرمہ میں رہنے کی اجازت دی کیوں کہ وہ لوگوں کے بہت کام آتے تھے اور غریبوں، مسکینوں اور قریش کے عام خاندان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان میں سب سے اہم حضرت عبداللہ بن الحام عدوی تھے۔ کچھ مخلص مسلمان تجارت کیلئے شام وغیرہ گئے ہوئے تھے جیسے حضرت زبیر بن عوام اسدی اور طلحہ بن عبید اللہ تمیمی وغیرہ۔ انہوں نے سفر اسے واپسی پر ہجرت کی۔ حضرت ابوبکر اور حضرت علی کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص مقصد سے روکے رکھا انہوں نے بعد میں آپ کے ساتھ یا بعد میں ہجرت کی۔

انصاری مدینہ کا حس سلوک:

مکہ کے مہاجروں نے پہلے مدینہ کی ایک بستی قباء میں کچھ دنوں قیام کیا اور پھر مدینہ منورہ کے خاص شہر پہنچے۔ دونوں جگہ کے انصاری مسلمانوں نے ان کا بہت محبت اور گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ان کو اپنے گھروں میں مہمان بنا کر رکھا۔ ان کے کھانے پینے رہنے سہنے اور ہر طرح کی دوسری ضروریات کا خیال رکھا۔ یوں تو سبھی انصاری مسلمان خیر خواہ اور مہمان نواز تھے اور

سب نے اپنی بساط بھران کی خدمت کی لیکن ان میں ممتاز لوگ یہ تھے: حضرت کلثوم بن ہدم (بنو عمرو بن عوف) حضرت سعد بن عبادہ خزرجی، حضرت سعد بن معاذ اوسی، حضرت اسید بن حضیر خزرجی اور حضرت اسد بن زرارہ خزرجی وغیرہ۔

خیر و محبت کے ان پیکروں نے مہاجرین کو اپنے مکانات دیے۔ باغات میں حصے دیے۔ زمینیں دیں، کاشتکاری کا سامان دیا۔ افتادہ اور خالی زمینیں ان کے حوالے کر دیں۔ یہاں تک اپنی دو یا زیادہ بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے کر ان سے نکاح کرنے کی پیش کش کی جو مسلمان مہاجرین نے قبول نہ کی۔ یہ بے مثال ایثار اور لافانی قربانی تھی اور اسلام کی تعلیمات اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت نے ان میں پیدا کی تھی۔ اسی قربانی ایثار اور اعانت کا مظاہرہ مکہ مکرمہ کے قریشی مالدار اور صاحب خیر مسلمانوں نے اپنے کمزور مسلمانوں بھائیوں کی مدد کر کے کیا تھا۔ یہ دراصل اسلامی اخوت اور دینی برادری کا ظاہری اظہار تھا۔ باطن میں ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بے پناہ محبت، خیر خواہی اور ایثار بھرا ہوا تھا۔

مہاجروں کے پیشے:

دوسری طرف قریشی اور مکی مہاجروں نے صرف انصاری مہمان نوازی اور ایثار و قربانی پر تکیہ کر کے مفت کے مزے لوٹنے میں زندگی بسر نہیں کی۔ انہوں نے اپنا فرض نبھایا اور انصاری بھائیوں کے حس سلوک کا اچھا بدلہ دیا۔ ان کے باغات اور کھیتوں میں محنت کر کے پیداوار بڑھائی۔ اپنی محنت مزدوری سے ان کی مدد کی۔ ان کے مکانات کی مرمت کی اور مختلف انداز سے ان کا ہاتھ بٹایا۔ بعد میں ان کا مالی بوجھ کم کیا۔ کسی نے تجارت شروع کر دی، کسی نے اپنی زمین پر کاشتکاری کی، کسی نے دستکاری کے جوہر دکھائے اور کسی نے محنت مزدوری سے اپنا پیٹ بھرا۔ تجارت کرنے والوں میں حضرت عبدالرحمن بن عوف زہری، حضرت عمر بن خطاب عدوی، حضرت عثمان بن عفان اموی ممتاز تھے۔ بعد میں حضرت ابوبکر تیمی، طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور دوسرے قریشی تاجر شامل ہو گئے۔

کاشتکاری کرنے والوں میں حضرت زبیر بن عوام اسدی وغیرہ کا نام آتا ہے۔ وہ کھیتی

باڑی اور باغبانی کے علاوہ تجارت بھی کیا کرتے تھے۔

دستکاری کرنے والوں میں حضرت سعد بن ابی وقاص زہری اور حضرت خباب بن الارت تمیمی وغیرہ تھے۔ وہ اپنا مال بنا کر خود بیچتے تھے۔

مفلس اور بے زر مہاجروں نے محنت مزدوری کی، کبھی اپنے دینی بھائیوں انصار کے ہاں، اور کبھی یہودی کاشتکاروں اور تاجروں کے گھروں میں یا ان کے کھیتوں اور باغوں میں زمین کی مزدوری کر کے اور پانی سے کھیتوں اور باغوں کی سیرپائی کر کے۔

ہجرت نبوی:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر مکی مہاجروں کے جانے کے بعد اپنی ہجرت کے لیے اللہ کے حکم کے منتظر تھے۔ جلد ہی اس کے اسباب فراہم ہو گئے۔ حضرت ابوبکر نے آپؐ کے ساتھ ہجرت کرنے کی خوش خبری سنی تو پھولے نہ سمائے اور سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انہوں نے دو اچھی اونٹیناں خریدیں اور ان کو کھلا پلا کر تیار کر لیا اور دوسرے انتظامات بھی کیے۔ تاکہ سفر ہجرت میں ان کے رسول محبوب کو زحمت نہ ہو۔

ادھر قریش مکہ کو یقین ہو گیا کہ جلد ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ منورہ کو ہجرت کر جائیں گے کیوں کہ مکہ تقریباً تمام بڑے مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔ اس لیے انہوں نے کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر لیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ آپؐ کا مکہ سے نکل جانا ان کے لئے خطرناک ہوگا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے دار النددہ میں تمام قریشی سرداروں کا اجلاس بلایا اور بڑی بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ کیا کہ تمام قریشی خاندانوں کے آدمی آپؐ پر صبح کے اندھیرے میں حملے کر کے آپؐ کو قتل کر دیں تاکہ خاندان بنو عبد مناف آپؐ کے قتل کا قصاص نہ لے سکیں۔

قتل کا منصوبہ:

اسی رات آپؐ کو ہجرت کر جانے کا حکم الہی آ گیا جس رات آپؐ کو قریش نے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ دوپہر میں خلاف معمول آپؐ حضرت ابوبکر صدیق کے گھر پہنچے اور ہجرت کرنے کے حکم الہی اور اس کے وقت سے ان کو باخبر کیا۔ آپؐ نے ابوبکر صدیق کو ایک

اونٹنی کی قیمت ادا کی۔ حضرت ابوبکر نے عبداللہ اسقط دہلی کو اجرت پر رہبر مقرر کر لیا۔ رات کو دشمنوں نے آپؐ کا گھر گھیر لیا لیکن اللہ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور وہ آپؐ کو گھر سے نکلنے نہ دیکھ سکے۔ آپؐ حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر لٹا کر اپنی چادر اوڑھادی اور ان کو حکم دیا کہ وہ صبح امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کر دیں اور پھر ہجرت کریں۔

ہجرت کا سفر:

مقررہ وقت پر آپؐ اطمینان سے گھر سے نکلے، دشمن غافل رہے۔ آپؐ حضرت ابوبکر کے گھر پہنچے۔ وہاں ان کی دونوں بیٹیوں حضرت اسماء اور حضرت عائشہ نے دونوں مہاجروں کے لیے توشہ دان تیار کیا اور دونوں مہاجرین مدینہ گھر سے نکل کر پہاڑ میں واقع غار ثور میں چھپ گئے۔ صبح کو دشمنوں نے آپؐ کے بستر پر حضرت علیؑ کو پایا تو بہت غصہ اور پشیمان ہوئے۔ ان کو مارا پیٹا۔ کچھ دیر بند رکھا مگر پھر چھوڑ دیا۔ آپؐ کا پیچھا کرنے کی تک و دو کی، پکڑ لانے کیلئے سوانٹ کا بھاری انعام مقرر کیا۔ حضرت ابوبکر کے گھر پر چھاپہ مار کر پوچھا تاچھ کی مگر نتیجہ نہ نکلا۔

تین دن بعد آپؐ نے غار ثور سے سفر شروع کیا۔ اس دوران حضرت ابوبکر کے نوجوان صاحبزادے عبداللہ برابر مکہ کی خبریں لاتے رہے۔ حضرت ابوبکر کے غلام حضرت عامر بن فہیرہ اردگرد کے علاقوں میں بکریاں چراتے اور رات میں دونوں مہاجروں کے لیے دودھ دے جاتے۔ تیسرے دن غار ثور سے مدینہ منورہ کا دوسرا غیر معروف راستہ پکڑا۔ دہلی راہ پر ساتھ تھا۔ مکہ کے ایک شخص سراقہ بن جہشم نے پیچھا کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

دوشنبہ یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی ۶۲۲ء کو آپؐ نے مکہ سے ہجرت کی، ۱۲ اور ۱۳ ربیع الاول کو آپؐ غار ثور میں رہے اور ۴ کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی لیکن کوئی پہچان نہ سکا۔ البتہ دو صحابیوں حضرت زبیر اور حضرت طلحہ نے پہچانا اور آپؐ کی خدمت میں کپڑوں کا ہدیہ پیش کیا۔

مدینہ آمد:

ادھر مدینہ منورہ میں آپؐ کی تشریف آوری کا شدت سے انتظار تھا۔ کیوں کہ لوگوں کو

آپؐ کی ہجرت کی خبر ملی چکی تھی۔ آٹھ دن کے سفر کے بعد دو شنبہ ۱۲ ربيع الاول ۱۳ نبوی ۲۳۱
 ستمبر ۶۲۲ء کو قباء پہنچے۔ وہاں کلثوم بن ہدم، (بنو عمرو بن عوف / اوس) کے یہاں کچھ دن مہمان
 رہے۔ قباء میں آپؐ نے ایک مسجد بھی تعمیر کی۔ جمعہ کے دن وہاں سے روانہ ہوئے اور بنو سالم
 بن عوف کی بستی میں پہلی نماز جمعہ پڑھی۔ وہاں سے مدینہ شہر کے لیے روانہ ہوئے۔

مدینہ میں ہر شخص آپؐ کی میزبانی کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری
 اونٹنی کو چھوڑ دو۔ وہ اللہ کے حکم سے جہاں بیٹھ جائے گی اسی جگہ قیام کروں گا۔ وہ حضرت
 ابویوب خالد بن زید بخاری / خزرجی کے گھر کے سامنے بیٹھ گئی اور آپؐ انھیں کے مہمان
 بنے۔ ان کے گھر میں آپؐ نے سات مہینے قیام کیا۔

اسلامی معاشرہ اور ریاست کی تشکیل

اسلامی معاشرہ کی تشکیل

مسجد نبوی کی تعمیر:

مدینہ منورہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اسلامی سماج کی تشکیل اور مسلمانوں کی تنظیم کا تھا۔ اسلام میں پوری سماجی زندگی کا مرکز مسجد ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ایک مسجد کی تعمیر کی فکر ہوئی۔ مدینہ منورہ میں دو یتیم بھائیوں سہل اور سہیل کی ایک خالی زمین تھی جس پر حضرت اسعد بن زرارہ مسلمانوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ آپؐ کو زمین پسند آئی اور آپؐ نے قیمت دے کر زمین خرید لی۔ حالانکہ وہ دونوں بچے خوشی سے ہدیہ کرنا چاہتے تھے۔

اسی زمین کو صاف کر کے مسجد تعمیر کی گئی۔ مسلمانوں کے ساتھ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گارا پتھر ڈھویا اور تعمیر میں حصہ لیا۔ کھجور کے تنوں کے ستون بنائے گئے اور کھجور کے پتوں سے چھت کچی اینٹوں اور گارے سے دیواریں بنائی گئیں۔ فرش کچا رہا۔ بعد میں اس پر کنکریاں بچھا کر کسی حد تک پکار کر لیا گیا۔ بارش کے بعد جب چھت ٹپکنے لگی تو اس پر بھی گارے کی لپائی کر دی گئی۔ ابتدا میں یہ مسجد ستر ہاتھ لمبی اور ساٹھ ہاتھ چوڑی تھی۔ پہلے قبلہ بیت المقدس کی طرف شمال مغربی سمت میں تھا۔ بعد میں کعبہ کی طرف جنوب میں ہو گیا۔

۲۔ مکانات نبوی کی تعمیر:

مسجد نبوی کے برابر میں دو چھوٹے چھوٹے مکان آپؐ نے بنائے۔ ایک حضرت سودہ کیلئے اور دوسرا حضرت عائشہ کیلئے۔ یہ مکان مسجد کی مشرقی سمت میں تھے۔ ان کے دو حصے تھے۔ اندر ایک چھوٹا سا کمرہ جو کچی اینٹوں اور کھجور کی چھت کا تھا اور باہر کھجور کی ٹیٹوں سے گھرا ہوا صحن۔ آنے جانے کے دروازے پر کبل کا پردہ ڈالا گیا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رہنے کے مکانات ہی نہ تھے بلکہ اسلام کی تعلیم و تربیت کے مرکز بھی تھے۔

کچھ دنوں بعد آپؐ نے حضرت حارثہ بن زید اور اپنے غلام حضرت ابورافع کو بھیجا کہ وہ آپؐ کے خاندان کو مکہ سے لے آئیں۔ حضرت ابوبکر نے بھی اپنا خاندان بلا بھیجا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان آگیا تو انہیں دونوں مکانوں میں رہنے لگا۔

۳۔ اسلام کی اشاعت:

مدینہ منورہ میں آپؐ کی آمد کے فوراً بعد ایک بڑے یہودی عالم حضرت عبداللہ بن (بنو قنیعہ) نے آپؐ سے بحث و مباحثہ کیا اور اسلام کو سچا پا کر قبول کر لیا۔ دوسرے یہودی عالموں نے خاص کر اور ان کے عوام نے عام طور سے ہٹ دھرمی سے سلام قبول نہ کیا۔ ایک ایرانی متلاشی حق حضرت سلمان فارسی نے بھی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ آپؐ نے مختلف محلوں میں جا جا کر باقی لوگوں میں اسلام پھیلایا۔

۴۔ مدینہ کی آبادی:

دراصل مدینہ منورہ میں آبادی کئی طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ دو مسلمان انصاری قبیلے اوس و خزرج تھے اور ان کے معتد خانوادے اور خاندان تھے۔ ان انصاری قبیلوں میں زیادہ تر لوگ تو مسلمان ہو چکے تھے لیکن کچھ خاندان تھے اور افراد غیر مسلم اور اپنے پرانے عرب دین..... بت پرستی..... پر قائم تھے۔ جلد ہی ان میں ایک اور طبقہ کا اضافہ ہو گیا، جن کو اسلام اصطلاح میں منافق کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن اپنے دل میں کفر پر جے ہوئے تھے۔ یہ اسلام کے سخت دشمن تھے۔

مسلمانوں کا دوسرا بڑا طبقہ مہاجرین پر مشتمل تھا۔ جو زیادہ تر مکہ مکرمہ سے آئے تھے اور قریش کے قبیلے سے تھے۔ کچھ دوسرے قبیلوں اور علاقوں کے مہاجر بھی تھے۔ غیر مسلم مقامی لوگوں میں ایک بڑا طبقہ یہودی قبیلوں پر مشتمل تھا جن کی تعداد دو درجن سے زیادہ تھی لیکن ان میں تین فیصلے..... بنو قریظہ، بنو النضیر اور بنو قریظہ..... بہت بڑے اور اہم تھے۔ مذہبی اور قبائلی فرق کے ساتھ ساتھ ان میں اقتصادی اور سماجی فرق بھی تھے۔

۵۔ مواخاۃ:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ مہاجروں کی آباد کاری اور مدینہ کے انصاری قبیلوں کے ساتھ ان کی ہم آہنگی کا تھا۔ اس کا حل آپؐ نے اسلامی اخوت کے تحت مواخاۃ کے طریقہ سے نکالا۔ ایک مہاجر اور ایک انصاری کو آپؐ نے ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا جس طرح مکہ مکرمہ میں دو ملکوں یا قریشیوں کے درمیان آپؐ نے مواخاۃ قائم کی تھی۔ مواخاۃ (بھائی چارہ) کا یہ سلسلہ شروع زمانہ سے مہاجروں کے آخری قافلہ کے آنے تک جاری رہا۔ شروع میں تقریباً چالیس جوڑے بھائیوں کے بنائے گئے۔ ان میں سے حضرت ابو بکر کے بھائی حضرت خارجہ بن زید خزرجی تھے۔ حضرت عمر کے بھائی عتبہ بن مالک ہوئے اور حضرت عثمان کے بھائی اوس بن ثابت تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف زہری اور حضرت سعد بن ربیع خزرجی بھائی بھائی تھے۔ اسی طرح دوسرے تمام مہاجروں کو انصار کا دینی بھائی بنادیا گیا۔

اس مواخاۃ کا مقصد یہ تھا کہ قبائلی تفریق ختم کی جائے اور ایک ایسے اسلامی معاشرہ کی تشکیل ہو جس میں علاقہ، قبیلہ، خون، رنگ، نسل اور نوات وغیرہ کی کوئی تفریق نہ ہو۔ اس کی بنیاد صرف سلام اور دین ہو۔ تمام مسلمان ایک دوسرے کے مددگار اور دوست ہوں۔ کمزور کو طاقتور سے مدد ملے اور طاقتور کمزور کا مددگار بنے۔ مہاجرین کو اس مواخاۃ کی اس لیے بھی ضرورت تھی کہ وہ اپنے وطن، خاندان اور رشتہ داروں وغیرہ کو چھوڑ کر آئے تھے۔ لہذا ان کو اجنبی ماحول میں بیگانگی سے چھٹکارا ملے اور انصار کو اس لیے حاجت تھی کہ وہ مہاجروں کو اپنے اوپر بوجھ نہ سمجھیں۔ اسی لیے یہ قانون بھی بنایا گیا کہ ایک بھائی کے مرنے پر اس کی جائیداد اور مال

اس کے دینی بھائی ہی کو ملے گی۔ بعد میں جب قانون وراثت قرآن مجید میں نازل ہوا تو یہ شق منسوخ ہو گئی اور باقی تمام چیزیں باقی رہیں۔ یہ مواخاۃ مستقل انتظام اور اسلامی معاشرہ کا اہم اصول تھا۔ اس انتظام سے مسلمانوں کا صرف ایک طبقہ..... مسلم..... رہ گیا اور مہاجرین انصار وغیرہ کے امتیازات مٹ گئے۔

(ب) اسلامی ریاست کا قیام

دستور مدینہ:

اب مسئلہ رہا غیر مسلموں اور یہودیوں کا کہ ان کو اسلامی معاشرہ کے ساتھ کس طرح سے جوڑا جائے اور کیوں کر مدینہ میں ان کا مقام متعین کیا جائے؟ اس مسئلہ کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب (معاہدے) نے تلاش کیا جس کو عام طور سے اب دستور مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس دستور مدینہ میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ کیا گیا اور ان حلیف قبیلوں اور خانوادوں کو بھی شریک کر لیا گیا۔

دستور مدینہ کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کل ۴۷ دفعات میں پہلی دفعہ واضح کرتی ہے کہ مسلمان ایک الگ امت ہیں اور غیر مسلم الگ دوسری امت۔ اس کی تائید مزید دوسری دفعات سے ہوتی ہے۔

پھر دو سے گیارہ دفعات یہ بتاتی ہیں کہ ہر قبیلہ اور خاندان اپنے اپنے طریقہ اور روایات کے مطابق دیت اور قصاص کے معاملات پنٹائیں گے۔ ان سے مدینہ کے تمام لوگوں کی جان و مال کے تحفظ کی ضمانت ملتی ہے۔

دفعات ۱۵-۱۴ اور ۱۹ کے مطابق مسلمان اگر کسی غیر مسلم کو قتل کر دے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس سے دیت یا خون بہا (خون کی قیمت) لے لی جائے گی۔

دفعات ۱۶-۱۷، ۲۱-۲۲، ۲۱-۲۰ اور ۴۷ نے مسلموں اور غیر مسلموں سب کے لیے ضروری قرار دیا تھا کہ وہ کسی مجرم یا باہر کے آدمی کو پناہ نہیں دیں گے۔

دفعات ۲۴ تا ۳۵ یہودی قبیلوں کو مذہبی اور تہذیبی آزادی دیتی ہیں جب کہ دفعات

۳۸-۳۶ اور ۴۶ یہودی قبیلوں کے لیے یہ لازم قرار دیتی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ تمام معاملات میں تعاون کریں یہاں تک کہ جنگ میں ساتھ دیں اور مدینہ پر حملہ ہو تو اس کا دفاع کریں اور بعض دوسری دفعات (۱۸-۲۴-۳۸ اور ۴۵) کے مطابق ان کو جنگ کے اخراجات بھی اپنے حصہ کے برابر اٹھانے لازمی تھے۔ بعض دفعات نے شہر مدینہ کو مقدس حرم قرار دیا جہاں کسی کا خون نہیں بہایا جاسکتا نہ ظلم و ستم کیا جاسکتا اور نہ فتنہ فساد برپا کیا جاسکتا ہے۔

حاکم اعلیٰ:

مدینہ منورہ کے اس دستور نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاکم اعلیٰ قرار دیا کہ مدینہ کے تمام لوگ..... مسلم و غیر مسلم..... اپنے تمام جھگڑے اور اختلافات فیصلے کے لیے آپ کے پاس لائیں گے اور آپ کے فیصلہ کو بے چون و چرا مان لیں گے (دفعہ ۲۳ ۲۲)۔ مدینہ کا کوئی شخص خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم آپ کی اجازت کے بغیر جنگ نہیں کرے گا۔ (دفعہ ۳۹)

اس طرح سماجی، شہری، سیاسی، فوجی اور قانونی غرضیکہ تمام اختیارات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آ گئے تھے۔ اقتدار اعلیٰ SOVEREIGNTY دراصل اللہ تعالیٰ کا حق و اختیار ہے مگر اس کے رسول اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے وہ آپ کو حاصل تھا۔ اور نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ غیر مسلموں کو بھی آپ کا اقتدار و حکمرانی تسلیم کرنی پڑی۔

ہجرت کے پانچ ماہ بعد یعنی شعبان ۱ھ افروری ۶۲۳ء میں یہ دستور مدینہ نافذ ہوا۔ اور اسی دن سے مدینہ ایک شہری اسلامی ریاست بن گیا۔ اس کی حدیں پورے شہر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس طرح پانچ چھ ماہ میں آپ نے دو کارنامے انجام دیئے۔ اول ایک اسلامی معاشرہ بنایا اور دوم ایک اسلامی ریاست قائم کی۔ یہ دونوں ابھی شہر مدینہ تک محدود تھے۔

مدینہ کی شہری ریاست کی توسیع

۱۔ اسلام کی تبلیغ:

یہ اسلام اور اسلامی ریاست کے لیے ضروری تھا کہ وہ مدینہ منورہ کے ارد گرد بے ہوئے

قبیلوں..... کنانہ، مزیہ، جہینہ وغیرہ..... اور ان کے چھوٹے خانوادوں اور قبیلوں سے تعلقات استوار کرے۔ ان کو اسلام کی دعوت دے، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو خود بخود وہاں اسلامی سماج اور اسلامی ریاست قائم ہو جاتی کہ اس طرح اللہ اور اس کے حکمران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار اعلیٰ بھی قائم ہو جاتا تھا۔

مدینہ کے قریب دو قبیلے مزیہ اور جہینہ آباد تھے اور ان کے مدینہ کے دونوں مسلمان قبیلوں اوس و خزرج سے جن کا اب مجموعی نام انصار تھا۔ حلف و دوستی کے تعلقات تھے۔ ان تعلقات نے ان کو اسلام سے معترف کرایا۔ وہ نہ صرف مسلمان ہو گئے بلکہ انہوں نے دوستانہ معاہدے کئے۔ اس طرح اسلامی ریاست مدینہ شہر سے آگے بڑھ کر ان کے علاقوں تک پھیل گئی۔

۲۔ ابتدائی مہمیں:

پڑوسی قبیلوں سے اسلام کا تعارف کرانے، سیاسی اور فوجی معاہدے کرنے اور ان کے علاقوں میں اسلامی ریاست کا اقتدار قائم کرنے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ شہر کے معاملات نپٹانے کے فوراً بعد اور ہجرت کے چھٹے مہینے ۱ھ ۶۲۳ء میں مختلف علاقوں میں چھوٹی چھوٹی مہمیں بھیجنے کا منصوبہ بنایا۔

وہ دو طرح کی تھیں: غزوات (واحد: غزوہ) اور سرایا (واحد: سریہ) غزوہ وہ مہم جس میں بے نفس نفیس آپؐ قیادت و کمان کریں اور سریہ جو آپؐ کے کسی صحابی کی کمان میں بھیجی گئی ہو۔ ان کی ابتدائی مہمیں کہا جاتا ہے اور ان کی تعداد عام طور سے آٹھ بتائی جاتی ہے۔ ممکن ہے اور بھی رہتی ہوں۔ آٹھ میں سے چار غزوات تھے اور چار سرایا۔

پہلا سریہ حضرت حمزہ ہاشمی کی قیادت میں سیف البحر (ساحل سمندر) کے علاقہ میں بھیجا گیا۔ اسی کے ساتھ دوسرا سریہ حضرت عبیدہ بن عارث مطلبی کی قیادت میں رابغ نامی مقام کی طرف روانہ کیا گیا۔ اس کے ایک ماہ بعد حضرت سعد بن ابی وقاص زہری اپنی مہم حرار کے علاقہ میں لے گئے۔ یہ سب مہمیں اس شاہراہ تجارت کے علاقوں میں گئی تھیں جس پر قریش کے کارواں گذرتے تھے۔

پھر رسول اللہ علیہ وسلم نے چار مہموں میں کمان کی: پہلی ابواء کے علاقے میں، دوسری بواط نامی مقام پر، تیسرے مہم میں آپؐ نے مکہ کے ایک حملہ آور کرز بن جابر فہری کا پیچھا کیا۔ جس نے مدینہ کی ایک چراگاہ پر حملہ کیا تھا۔ چوتھی العشیرہ کے علاقے میں لے گئے۔

ان تمام مہموں میں نہ کوئی جنگ ہوئی اور نہ لڑائی ہوئی اور نہ کسی سے مڈ بھڑ۔ ان کا مقصد دراصل قرہمی قبیلوں سے دوستی کرنا تھا چنانچہ قبیلہ کنانہ کے دو خاندانوں بنو ضمہ اور مدح اور ان کی شاخوں سے دوستی کے معاہدے ہوئے۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قریش کو سمجھا دیا جائے کہ مدینہ کی شہری ریاست کا احترام کرے۔

آخری مہم سریہ نخلہ تھا جو حضرت عبداللہ بن جحش کی قیادت میں مکہ کے قریب واقع شہر نخلہ کے پاس بھیجا گیا تھا کہ قریش کی خبریں لائے مگر وہاں اچانک ایک قریشی کارواں سے مسلمانوں کی مڈ بھڑ ہوئی اور اس میں مسلمان کامیاب رہے۔ انہوں نے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور ان کے سامان پر قبضہ کر لیا۔

نخلہ کے سریہ اور کرز بن جابر فہری کے تعاقب میں کئے گئے غزوہ نبوی نے قریش کے گھمنڈی سرداروں پر واضح کر دیا تھا کہ اب مسلمانوں کو دبایا نہیں جاسکتا۔ دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی ریاست کی حدیں شہر مدینہ سے نکل کر قرب و جوار کے علاقہ میں پھیل گئیں۔

۳۔ غزوات کا سلسلہ:

اسلام کا مقصد بلاوجہ جنگ کرنا نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنگ کے بجائے معاہدوں اور تبلیغ دین کے ذریعہ اسلام پھیلانا چاہتے تھے لیکن اگر کوئی جنگ وجدال پر مجبور کرے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جنگ کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ (قرآن مجید، سورہ حج ۳۹ وغیرہ) کیوں کہ کبھی کبھی جنگ بھی امن قائم کرنے کیلئے ضروری ہو جاتی ہے۔ خاص کر اس صورت میں جب کوئی دشمن اسلام اور مسلمانوں پر حملہ کرے یا سازشوں کے ذریعہ ان کے درپے ہو جائے۔

غزوہ بدر: اسباب

قریش مکہ نے ایک بڑے پیمانے پر ایک تجارتی کاروں ہجرت نبوی کے چوتھے مہینے کے بعد ابوسفیان بن حرب اموی کی کمان میں شام بھیجا۔ اس میں مکہ کے تمام مالداروں کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے نے پیسہ لگایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ اس کارواں کی خبر سے آپؐ کو تشویش ہوئی کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے کیوں کہ اس سے پہلے قریشی سرداروں نے یہودی قبیلوں سے اسلام اور اسلامی ریاست کے خلاف ساز باز کی تھی۔ انہوں نے منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول، خزرجی کو بھی خط لکھے تھے کہ آپؐ کو مدینہ سے نکال دیں ورنہ شہر پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ ان حالات میں اتنے غیر معمولی کارواں کو بھیجنے سے آپؐ کا ماتھا ٹھنکا۔ اور آپؐ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس کارواں کو روک لیا جائے تاکہ قریش کو اندازہ ہو جائے کہ مسلمان سے بڑکران کی شامی تجارت کا راستہ بالکل بند ہو جائے گا۔ یہ ان پر پہلے بھی واضح تھا مگر آپؐ ان کو اپنی طاقت دکھا کر صلح پر مجبور کرنا بھی چاہتے تھے، ذوالعشیرہ کا غزوہ اسی مقصد سے ہوا تھا لیکن آپؐ کو دیر سے خبر ملی اور کارواں شام پہنچ گیا۔

اس کی واپسی پر پھر آپؐ اس کو روکنے کی غرض سے تین سو چودہ مسلمانوں کے ساتھ نکلے جن میں ۸۳ مہاجر اور ۲۳۱ انصاری تھے۔ ابوسفیان اموی تجربہ کار سپاہی اور ماہر جنگ ہونے کے علاوہ قریشی افواج کے سپہ سالار تھے۔ ان کو خدشہ تھا کہ واپسی پر ان کا کارواں روکا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مکہ والوں کو کارواں کی حفاظت کیلئے ایک فوج بھیجنے کیلئے کہا۔ قریش کو جب اس کی خبر ملی تو وہ ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل کیل کاٹے سے لیس فوج لے کر نکلے جس میں قریش کے تمام بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ ادھر ابوسفیان اموی نے ہوشیاری کی اور کارواں کا راستہ تبدیل کر کے اسے بچالے گئے۔ اسلامی لشکر اس کا بدر کے مقام پر انتظار کرتا رہ گیا۔ کارواں کے بچنے کے بعد ابوسفیان اموی نے قریشی فوج کو واپس مکہ جانے کیلئے لکھا لیکن ابو جہل مخزومی وغیرہ اڑ گئے کہ ہم تو بدر جا کر وہاں جشن منائیں گے اور عرب کو مرعوب کریں گے تاکہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ چنانچہ وہ بدر جا پہنچے۔ دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو مسلمانوں کی کم تعداد دیکھ کر جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ امن وامان چاہنے والے قریشی اس

جنگ کے حق میں نہ تھے مگر ان کی ایک نہ چلی۔

جنگ بدر:

نتیجہ یہ ہوا کہ ۷ ارمضان المبارک ۶۲۴ء/ ۲۳ مارچ ۶۲۳ء کو دونوں کے درمیان جنگ ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی چھوٹی سی فوجی کو اپنی رحمت خاص اور مسلمانوں کے صبر و استقلال کی وجہ سے فتح کامل دی۔ مسلمانوں کو بہت سامان غنیمت ملا۔ ان کے کل چودہ مجاہد شہید ہوئے۔ جب کہ قریش کے ستر آدمی مارے گئے جن میں بڑے بڑے سردار جیسے ابو جہل مخزومی، عتبہ بن ربیعہ عبد شمس اور اس کا بھائی شیبہ وغیرہ شامل تھے اور ستر ہی گرفتار ہو کر جنگی قیدی بنے۔ بعد میں دو کے سوا سب فدیہ لے کر چھوڑ دیے گئے۔

اثرات:

جنگ بدر اور مسلمانوں کی فتح کا بہت گہرا اثر پڑا۔ قریش کی ساکھ بکھر گئی۔ اور ان کی عزت پر حرف آیا۔ مسلمانوں کا رعب و دبدبہ قائم ہوا۔ قریبی قبیلوں نے اسلامی ریاست کے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے۔ قرب و جوار میں اسلام کا فروغ ہوا اور اسلامی ریاست کی سرحدیں اور پھیلیں فتح بدر کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل بھی بڑھے۔ اسلام دشمنی نے بھی محسوس کر لیا کہ اسلامی ریاست وسیع اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے مدینہ منورہ کے یہودی قبیلوں نے اپنی حرکتیں شروع کیں۔ قرب و جوار کے بعض قبیلوں نے دشمنی پر کمر باندھی اور قریش مکہ تو اب جانی دشمن بن چکے تھے۔ مسلمانوں کی اندرونی صفوں میں منافقوں کی سازشیں بھی بڑھیں۔ اسلام اور آپؐ کو اب زیادہ خطرہ درپیش تھا۔ دراصل آپؐ کو اب چوکھی لڑائی لڑنی تھی۔

قریش کے حملے:

بدر کی شکست نے پہلے تو قریش مکہ کو ہکا بکا کر دیا۔ زخم بھر چلے تو انہوں نے اس کا انتقام لینے کے لیے زبردست تیاریاں کیں۔ ان کے انتقال کی آگ اور جنگ کے شعلے بھڑکانے میں مدینہ منورہ کا ایک یہودی سردار شاعر کعب بن اشرف سب سے آگے آگے تھا۔ قریشی نے پہلے

مکہ کے ایک تاجر اور سپاہی بن وہب کو بھیجا کہ وہو کہ سے آپؐ کو قتل کر دے مگر اللہ کا کرنا کہ جیسے ہی اس نے آپؐ کے چہرہ انور کی طرف دیکھا وہ اسلام لا کر آپؐ کا جاں نثار بن گیا۔ جنگ بدر کے بعد ابوسفیان اموی نے ایک لشکر کے ساتھ مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر کے کچھ لوگوں کو مار ڈالا اور کھیتوں کو آگ لگا دی۔ آپؐ نے خبر ملنے پر ان کا پیچھا کیا تو وہ بھاگ نکلے اور بھاگتے میں اپنے ستو کے بورے پھینکتے گئے۔ اس لیے یہ غزوہ السویق کہلاتا ہے جو ذی الحجہ ۶۲۳ء میں ہوا۔

اس کے چار پانچ مہینوں کے بعد آپؐ نے حضرت زید بن حارثہ کی ماتحتی میں ایک لشکر بھیجا جس نے صفوان بن امیہ کی قیادت میں جانے والے ایک تجارتی کارواں پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں کو بہت مال غنیمت ملا۔ کارواں کے لوگ البتہ بچ کر بھاگ نکلے۔ غزوہ بدر کے بعد جب جنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو آپؐ نے قریشی تجارت کی ناکہ بندی کر دی۔ اور ایسی سخت کہ پھر اس کے بعد کوئی مکی کارواں شام نہ جاسکا۔ قریش کیلئے یہ موت و زندگی کا سوال تھا۔ اس لیے انہوں نے آخری فیصلہ کر لیا۔

غزوہ احد:

شوال ۳ھ / مارچ ۶۲۵ء میں ابوسفیان اموی کی قیادت میں ایک بڑے مکی لشکر نے جو تین ہزار مسلح سپاہیوں اور دو سو شہسواروں پر مشتمل اور ہر طرح سے چالیس تھا، مدینہ پر حملہ آور ہوا، وہ بڑھتے بڑھتے مدینہ کے قریب پہنچ گیا اور شمال میں واقع احد نامی پہاڑ پر اپنی فوجیں جمالیں اور بہترین جگہوں پر قبضہ کر لیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر تجربہ کار لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا بڑے لشکر کا مقابلہ شہر میں محصور ہو کر کرنا چاہئے۔ کھلے میدان میں جانا ٹھیک نہیں لیکن کچھ نا تجربہ کار اور زیادہ تر جو شیلے جوانوں نے آپؐ کو کھلے میدان میں لڑنے پر مجبور کر دیا۔ آپؐ نے احد کے دامن میں اپنی فوج جمائی اور پہاڑ کے ایک کھلے درے پر جہاں سے عقبی حملہ ہو سکتا تھا تیر اندازوں کا ایک دستہ مقرر کیا اور ان کو ہدایت کی کہ کسی بھی حال میں اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ مگر جب جنگ شروع ہوئی اور مسلمانوں کا پلڑا بھاری نظر آیا تو پچاس میں سے چالیس تیر اندازوں نے اپنے کمان دار کی حکم عدولی کرتے ہوئے جگہ چھوڑ دی اور لوٹ مار میں

لگ گئے۔ دوسری طرف قریشی لشکر بھاگ کھڑا ہوا تھا مگر موقعہ دیکھ کر خالد بن ولید مخزومی نے اسی درے سے پیچھے سے حملہ کر کے مسلمانوں کی فتح کو ہار میں بدل دیا۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سخت زخمی ہوئے۔ ستر کے قریب بڑے بڑے مسلمان شہید ہوئے جن میں حضرت ہاشمی، حضرت بن عمیر عبدری وغیرہ شامل تھے۔ مجموعی لحاظ سے سخت جانی اور مالی نقصان ہوا۔ پھر آپؐ نے اپنی فوجوں کو جمع کر کے حملہ کیا تو قریشی پسپا ہو گئے۔ بعد میں آپؐ نے حمراء الاسد نامی مقام تک ان کا پیچھا کیا۔ مسلمانوں کے بعض سپاہیوں کی غلطی اور نافرمانی سے اسلامی فوج کو سخت نقصان پہنچا اور ان کی ساکھ کو دھکا لگا۔ لیکن یہ نقصان عارضی ثابت ہوا۔ کیونکہ آپؐ نے دوسرے محاذوں پر کئی عظیم فتوحات حاصل کی تھیں

غزوہ بدر ثانی:

اگلے سال ذوقعدہ ۲ھ ۱۱ اپریل ۶۲۶ء میں ابوسفیان اموی کی کمان میں ایک قریشی فوج نے پھر حملہ کرنے کے لیے پیش قدمی کی مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدام سے گھبرا کر لوٹ گئے۔ آپؐ بدر میں کچھ دن قیام کر کے مدینہ لوٹ آئے۔

غزوہ خندق:

ان چھوٹی چھوٹی مہموں سے قریش کا نہ تو وقار بلند ہوا۔ نہ ساکھ بنی اور ان کا اصل مقصد حل ہوا۔ لہذا انہوں نے ایک بڑے متحدہ محاذ بنایا جس میں قریش کے علاوہ کئی عرب قبیلے جیسے غطفان، بنو سلیم اور بنو اسد وغیرہ شامل ہو گئے۔ ادھر مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو قریظہ نے بھی ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ یہ لشکر کئی لشکروں اور فوجوں پر مشتمل تھا۔ اس لیے احزاب کہلایا۔ اس میں تجربہ کار دس ہزار سپاہی تھے۔ اسلامی فوج صرف تین ہزار سپاہ پر مشتمل تھی۔

شوال ۵ھ ۱۱ اپریل ۶۲۷ء میں احزاب کے لشکر نے مدینہ پر حملہ کرنے کیلئے مکہ سے پیش قدمی کی۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے مشورہ سے خاص کر حضرت سلمان فارسی کی رائے پر مدینہ کے شمال میں خندق کھود لی۔ باقی تین طرف سے مدینہ ۷۰۰ (لاوے کے ٹیلوں) کے سبب محفوظ تھا۔ لشکر احزاب جب مدینہ پہنچا تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ

خندق کا کیا حل نکالیں۔ ناچار وہ شہر کا محاصرہ کیے پڑے رہے۔ ان کے سواروں نے کئی بار اس کو پار کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ تیر اندازی کی جنگ البتہ ہوئی مگر مسلمانوں نے انھیں مار بھگایا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر تیز ہواؤں، سردی کے جھکڑوں اور دوسری بلاؤں کو بھیجا اور قریشی اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ بنو قریظہ کو آپؐ نے الگ تھلگ کر کے دشمن کو حملے کرنے کا موقع نہ دیا۔ قریشی اتحاد میں رخنہ پڑ گیا اور کئی قبیلے الگ ہو گئے۔ بالآخر وہ ناکام و نامراد لوٹ گئے۔ یہ جنگ ذوقعدہ ۵ھ / مارچ اپریل ۶۲۷ء میں ختم ہوئی۔

قریشی جارحیت کا خاتمہ:

قریش کا اتنا بڑا حملہ ناکام رہا تو ان میں باہمی پھوٹ پڑ گئی، ان کا اعتماد جاتا رہا۔ اور ہمیشہ کے لے ان کی ساکھ ختم ہو گئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب کی واپسی پر فرمایا کہ ”اب تک قریش ہم پر حملہ کرتے رہے۔ اب ہم ان پر حملہ کریں گے۔“ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب اقدام (INITIATIVE) مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اسی مقام سے قریش کا زوال شروع ہو گیا اور اسلامی ریاست ارتقاء تو سب کے منازل سے گزرنے لگی۔

اسلام اور اسلامی ریاست کا عروج

اندرونی دشمن: منافقین و یہود

منافقین:

قریش اور ان کے اتحادی قبیلوں کی فوج تو باہری دشمنوں پر مشتمل تھی۔ ان سے بچنے کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر کے دشمنوں..... یہودیوں اور منافقوں..... سے بھی بدسر پیکار رہنا پڑا، گھر کے بھیدی زیادہ خطرناک تھے اور ان کی سازشیں اور کوششیں نفرت و انتقام پر مبنی تھیں۔ منافقین کھل کر تو آپؐ کے خلاف نہ آسکتے تھے مگر اندرونی طور سے آپؐ کے سخت دشمن تھے۔ وہ ہمیشہ اندرونی دشمنوں یہودیوں کے ساتھ ساز باز کرتے تھے یا باہری دشمنوں قریش وغیرہ کو امداد دیتے رہتے تھے۔

انہوں نے کئی موقعوں پر قریش کو خبریں پہنچائیں۔ غزوہ احد میں عین موقع پر ان کا سردار عبداللہ ابن ابی اپنے ڈھائی سو سپاہیوں کو لے کر الگ ہو گیا اور مسلمانوں کی تعداد صرف ساڑھے سات سو رہ گئی۔ جنگ خندق کے موقع پر انہوں نے بنو قریظہ اور دوسرے یہودیوں کو آپؐ پر عقب سے حملہ کرنے پر اکسایا اور تو بچ گئے مگر بنو قریظہ اس کے جھانے میں آ گئے۔ ان منافقوں کی اپنی کوئی طاقت تو تھی نہیں لہذا آپؐ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے خلاف کوئی راست اقدام نہ کیا جائے۔ مگر ان کی سازشوں سے باخبر رہ کر ان کے حلیفوں پر ایسی مار ماری جائے کہ

آستین کے سانپ اپنے زہر کا خود شکار ہو جائیں۔

یہود مدینہ:

یہودی قبیلوں نے آپؐ سے دستور مدینہ کے تحت دوستی و تعاون کے معاہدے کر رکھے تھے لیکن وہ اپنے دلی حسد اور دشمنی سے بھی مجبور تھے۔ برابر سازش کرتے رہتے اور سلام اور آپؐ کو زک دینے کے مواقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔

غزوہ بنی قینقاع ۳ھ / ۶۲۵ء: غزوہ بدر کے بعد آپؐ نے تمام یہودی قبیلوں سے معاہدہ دوستی کی مزید تصدیق کرنے کو کہا تا کہ ان کا رویہ معلوم ہو سکے اور ان کو بتایا جاسکے کہ وہ مسلمانوں کی طرح مدینہ کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ سب قبیلوں نے موقعہ کی نزاکت سمجھ کر معاہدوں کی از سر نو تصدیق کر دی مگر قبیلہ بنو قینقاع نے نہ صرف معاہدے کی تصدیق کرنے سے انکار کیا بلکہ آپؐ کو جنگ کی دھمکی بھی دی۔ اپنے غرور میں انہوں نے ایک مسلمان عورت کی جوان کے سناری کے بازار میں کام سے گئی تھی، بے عزتی کی۔ جس پر ایک مسلم نوجوان نے مجرم کو مار ڈالا۔ دستور مدینہ کے مطابق یہودیوں نے مقدمہ آپؐ کے پاس لانے کے بجائے مسلم کو خود مار ڈالا۔ جب آپؐ نے بنفس نفیس جا کر ان کو سمجھانے کی کوشش کی تو انہوں نے معاہدہ ہی توڑ ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپؐ نے ان کے قلعوں اور باغوں کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور آپؐ نے ان کو سارے سامان و مال و اسباب کے ساتھ شہر سے نکال دیا اور وہ شام چلے گئے۔

غزوہ بنی النضیر ۳ھ / ۶۲۵ء: غزوہ احد کے بعد اس یہودی قبیلہ نے سرکشی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ ایک دیت کی رقم میں بنو النضیر سے ان کا حصہ لینے کے لئے آپؐ ان کے علاقہ میں گئے تو انہوں نے آپؐ کو مار ڈالنے کی سازش کی۔ ظاہر ہے کہ آپؐ نے ان کو شہر سے نکلنے کا حکم دیا مگر انہوں نے انکار کیا۔ جس کے پیچھے منافقوں کا ہاتھ تھا۔ وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہے۔ ان کا بھی پندرہ بیس دن محاصرہ رہا تھا۔ انہوں نے بھی گھٹنے ٹیک دیے۔ ان کو مدینہ سے نکالا تو وہ خیبر میں جا بے۔

غزوہ بنی قریظہ ۵ھ ۶۲۷ء: لیکن ان یہودیوں کا جرم سب سے بڑا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف احزاب سے مل کر جنگ لڑنا چاہی وہ اپنی بزدلی اور آپؐ کی بروقت کارروائی سے کامیاب نہ ہو سکے۔ جنگ خندق کے خاتمہ اور احزاب کی واپسی پر آپؐ نے اللہ کے حکم سے ان کا محاصرہ کر لیا۔ ایک ماہ کے بعد انہوں نے بلا شرط ہتھیار ڈال دیئے۔ خود یہودیوں کے مقرر کیے ہوئے حکم حضرت سعد بن معاذ اوسی نے تورات کے مطابق فیصلہ کیا کہ ان کے تمام بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے بیوی بچوں اور مال و جائیداد پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس فیصلہ پر عمل کیا گیا۔ بعض جدید مورخوں نے کہا ہے کہ صرف سرداروں کو قتل کیا تھا اور باقی کو معاف کر دیا گیا تھا مگر ابھی تک اسے علماء نے تسلیم نہیں کیا بہر حال ان تینوں غزوں کے سبب مدینہ سے یہودیوں کی سازش ختم ہوئی۔ باقی یہودی قبیلوں نے دوستی اور تعاون کے معاہدہ کا ہمیشہ احترام و اقبال کیا لہذا ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور وہ امن و امان سے رہتے رہے۔

۵ھ ۶۲۷ء کا سال اسلام اور اسلامی ریاست کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ اس برس آپؐ نے قریشی حملوں سے نجات پائی اور اندرونی دشمنوں..... یہودیوں..... کی طاقت بالکل کچل دی۔ دونوں طاقتوں پر پلٹنے والے منافقوں کا کس بل از خود نکل گیا۔ اس زمانے میں کئی عرب قبیلوں نے سرکشی اور سازش کی اور آپؐ کو ان کے خلاف کئی سرایا بھیجی پڑیں یا غزوات لے جانے پڑے۔ قبائل عرب کے خلاف اہم ترین مہمیں یہ تھیں۔

غزوہ بدر کے چھ ماہ بعد آپؐ نے بنو عطفان کے ایک لشکر کی سرکوبی کی۔ یہ غزوہ الکدر کی مہم تھی۔ پھر اسی ماہ آپؐ نے غزوہ ذوامر کی مہم میں عطفان کے خاندان بنو ثعلبہ اور بنو محارب کے خلاف کارروائی کی۔ اس کے دو ماہ بعد بنو سلیم کے خلاف ایک بار پھر نکلے۔ یہ غزوہ بحران تھا۔ ان مہموں میں لڑائی نہیں ہوئی مگر مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا۔ ان کو مال غنیمت ملا، اسلام کی اشاعت ہوئی اور اس کی سیاسی اور فوجی دھاک جم گئی۔

احد و خندق کے درمیان عرب قبیلوں کے درمیان سات مہمیں بھیجی گئیں۔ حضرت ابوسلمہ مخزومی کا سریہ قبیلہ بنو اسد کے خلاف کامیاب رہا۔ بنو لحيان کے خلاف حضرت عبداللہ بن انیس نے کارروائی کی اور ان کے سردار کو قتل کر دیا۔ مسلمان کو دو تبلیغی جماعتوں کے قتل کا صدمہ اٹھانا

پڑا۔ یہ بُر معونہ اور رنجیع کے سرے تھے۔ جن کے سارے مبلغوں کو بالترتیب بنو سلیم کے دو قبیلوں اور بنو لحيان کے دو خاندانوں نے قتل کر دیا۔

پھر تابتوڑ تین غزوات کی قیادت خود آپؐ نے کی: غزوہ ذات الرقاع میں آپؐ نے ثعلبہ اور ان کے ساتھی خاندانوں کے حملوں کو روکا۔ غزوہ دومتہ الجندل کے منصوبوں کو خاک میں ملایا۔ ان دونوں غزوات میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی کیوں کہ دشمن آپؐ کی خبر پا کر بھاگ گیا تھا۔ لیکن آخری مہم غزوہ مرسیع ابنی المصطلق میں آپؐ نے قبیلہ بنو مصطلق کے ہونے والے حملہ کو روکنے کیلئے جو اقدام کیا اس میں جنگ ہوئی اور دشمن کو زبردست ہزیمت ہوئی۔ ان کے بہت سے قیدی ہاتھ لگے اور کثیر مال غنیمت ملا لیکن آپؐ نے ان کے سردار کی بیٹی حضرت جویریہ بنت حارثہ خزاعی سے شادی کر کے اور ان کے قیدیوں کو رہا کر کے ان کے دل جیت لیے وہ سب مسلمان ہو گئے۔

جنگ خندق کے بعد آپؐ کو سال بھر کی مدت میں تقریباً پندرہ مہینے بھیجی پڑیں، بنو محارب کے خلاف سریہ القرطاء بھیجا گیا جس نے ان کے شر پسندوں کو مار بھگایا۔ بنو لحيان کے خلاف آپؐ نے واقعہ رجع کے شہیدوں کا بدلہ لینے کیلئے کارروائی کی۔ اس کے اگلے ماہ غزوہ غابہ میں آپؐ نے بنو فزارہ کے حملہ آوروں کو پسپا کیا۔ حضرت عکاشہ بن محسن اسدی کی مہم سریہ غمر میں بنو اسد کے خلاف کارروائی کی گئی۔ ذوالقصد کے سریہ میں حضرت محمد بن مسلمہ اسی کے سپاہیوں کو بنو ثعلبہ نے قتل کر دیا تو اس کا بدلہ لینے کے لئے حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کی فوج بھیجی۔

اس کے بعد حضرت زید بن حارثہ نے چار مہینے سرانجام دیں: سریہ جموم بنو سلیم کے خلاف، سریہ طرف بنو ثعلبہ کے خلاف، سریہ حسماء قبیلہ جذام کے خلاف اور سریہ وادی القرئی بنو فزارہ کے خلاف۔

پھر حضرت عبدالرحمن بن عوف زہری کے سریہ دومتہ الجندل نے بنو کلب کے خلاف کارروائی کر کے ان سے مال غنیمت حاصل کرنے کے علاوہ عیسائیوں سے جزیہ لیا۔ حضرت زید بن حارثہ کی ماتحتی میں ایک مسلم تجارتی کارواں بن گیا تھا جس کو بنو فزارہ نے لوٹ لیا تو ان کے خلاف سریہ ام قرفہ کی مہم میں کارروائی کی گئی۔ عرینہ کے ڈاکوؤں کو سریہ کرز بن جابر فہری نے سزا دی اور حضرت زید بن حارثہ نے مدین کے لوگوں کو سرکشی کا مزہ چکھایا۔ سوائے دو کے باقی

تمام مہموں میں مسلمانوں کو کامیابی ملی۔

قریش کے خلاف اقدام

عمرہ حدیبیہ:

ذوقعد ۲ھ / مارچ ۶۲۸ء میں آپؐ نے عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ کا سفر اختیار کیا۔ اس میں اصل مقصد تو مذہبی تھا لیکن سیاسی اور فوجی مضمرات بھی موجود تھے آپؐ قریش کی طاقت کو آزمانا اور ان کے رویہ کو واضح کرنا چاہتے تھے۔ قریش کے کس بل لاکھ نکل گئے ہوں مگر وہ اتنی آسانی سے آپؐ کو مکہ نہیں آنے دینا چاہتا تھے خواہ آپؐ کا مقصد مذہبی کیوں نہ ہو۔ مکہ کے قریب پہنچ کر آپؐ نے حدیبیہ کی وادی میں قیام کیا۔ قریش اور ان کے حلیفوں میں اختلاف ہو گیا۔ ان کے خلیفہ کہتے تھے کہ کعبہ کا طواف و عمرہ کرنے والے کو نہیں روکا جاسکتا خواہ وہ مسلمانوں ہوں۔ ان کے ہمنوا کئی قریشی سردار بھی تھے۔

صلح حدیبیہ:

آخر کئی قریشی وفد کے آنے جانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیروں کی آمد و رفت کے بعد قریش نے مسلمانوں سے صلح کا معاہدہ کر لیا۔ یہ صلح حدیبیہ کہلاتی ہے اس کی شرطیں یہ تھیں:

- (۱) دونوں فریق دس سال تک جنگ نہ کریں گے۔
 - (۲) مسلمان اس سال بلا عمرہ کیے واپس جائیں گے۔ اگلے سال عمرہ کرنے آئیں گے ان کو صرف تین دن مکہ میں رہنے کی اجازت ہوگی۔
 - (۳) اگر مکہ کا کوئی شخص مدینہ چلا گیا تو مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہوگا مگر قریش مدینہ سے آنے والوں کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔
 - (۴) عرب قبائل میں سے جو چاہے قریش سے یا آپؐ سے معاہدہ کر لے۔
- اس صلح کی تمام شرطیں اگرچہ مسلمانوں کے خلاف تھیں اور اکثر مسلمان اس سے ناخوش بھی تھے مگر وہ آپؐ کے فیصلے سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو فتح مبین (کھلی

ہوئی فتح) قرار دیا۔ کیوں کہ اس میں جو فائدے پوشیدہ تھے وہ سراسر مسلمانوں اور اسلام کے حق میں تھے۔ (سورہ فتح کی ابتدائی آیات)

صلح حدیبیہ کے اثرات:

اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ قریش نے مسلمانوں اور اسلامی ریاست کو برابر کا فریق تسلیم کر لیا۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ وہ قبیلے جو روایتی طور سے قریش کے حلیف اور ان کے پڑوسی رہے تھے۔ اسلامی ریاست کی ابھرتی طاقت کے ہم نوا بن گئے۔ صلح کی تکمیل کے فوراً بعد اگر قبیلہ بنو بکر بن عبد متاہ نے قریش سے دوستی اور تعاون کا معاہدہ کیا تو قبیلہ خزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ ہجرت کے بعد اب تک مسلمانوں اور قریش مکہ کا صلح جو یا نہ اختلاط نہیں ہوا تھا۔ اب جو آزادانہ ملاقاتیں ہوئیں۔ تو انہیں اسلام پر کھنسنے کا صحیح موقع ملا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دو برسوں میں اتنی کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے کہ اب تک نہ ہوئے تھے۔

ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کو قریشی مخالفت سے نجات ملی تو انہوں نے اپنی اسلامی ریاست کی توسیع و تعمیر اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی نئی کوششیں شروع کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سلسلہ میں پڑوسی ملکوں ایران، (ساسانی سلطنت) عراق، شام (بازنطینی سلطنت) مصر اور حبشہ کے حکمرانوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور متعدد عرب حکمرانوں کے نام بھی خطوط لکھے، جن کے اچھے اثرات نکلے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسی صلح حدیبیہ نے فتح مکہ کی راہ ہموار کر دی۔

عرب قبیلوں کے خلاف مہمیں:

۸-۶ھ ۳۰/۶۲۸ء کے دو برسوں کے درمیان آپ قریش مکہ کی طرف سے مطمئن ہو کر دوسرے عرب قبیلوں کی طرف زیادہ متوجہ رہے اور ان کے خلاف چھوٹی بڑی سولہ مہمیں بھیجیں: ان میں طاقتور قبیلہ ہوازن کی مختلف شاخوں کے خلاف پانچ مہمیں تھیں تو دوسرے انتہائی طاقتور قبیلہ غطفان کے خلاف بھی اتنی ہی مہمیں بھیجیں۔ باقی مہمیں بنو سلیم، ملوم، جبینہ، قضاہ اور غسان وغیرہ کے خلاف تھیں۔

یہ سرایا دراصل فوجی دستے تھے جو شرانگیزوں اور مفسدوں کے خلاف کارروائیاں کرنے گئے تھے۔ وہ پورے قبیلے کے خلاف جنگی کارروائی نہیں تھی۔ فوجی طاقت کے لحاظ سے بھی یہ چھوٹے چھوٹے دستے تھے، فوجیں نہ تھیں۔ ان میں سے بعض مہمیں جیسے ذات الاطلاق کی مہم فوجی نہ تھی بلکہ تبلیغ اسلام کرنے کی جماعت تھی۔

ان میں سے دوسرا اہم تھے: ایک غزوہ موتہ کے نام سے مشہور ہے جو حضرت زید بن حارثہ کی کمان میں بھیجی گئی۔ ان کا میدان کار فلسطین کا ایک علاقہ تھا جہاں مسلمانوں کے تین ہزار کے لشکر نے رومیوں کے ایک بڑے لشکر سے مقابلہ کیا۔ مسلمانوں کے تین کماندار حضرت زید، حضرت جعفر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ اور بعض مسلمان سپاہی شہید ہوئے پھر حضرت خالد بن ولید مخزومی کی کمان میں وہ کامیابی کے ساتھ واپس مدینہ منورہ لوٹ آئی۔ دوسری مہم ذات السلاسل کے نام سے جانی جاتی ہے جو حضرت عمرو بن العاص کی قیادت میں شامی سرحد پر بے دو قبیلوں ملی اور قضاء کے خلاف کامیاب رہی۔

ان تمام مہموں میں اسلامی ریاست کو کامیابی ملی۔ بہت سے قبیلے اور ان کے خاندان اسلام لائے، یا انہوں نے اسلامی ریاست کی سیاسی بالادستی تسلیم کی۔ شریکوں کی سرکوبی ہوئی۔ امن و امان قائم ہوا۔ اور اسلامی ریاست کی حدیں شامی سرحدوں کو چھونے لگیں۔

یہودیوں کے خلاف کارروائی:

مدینہ منورہ کے یہودی قبیلوں کی طاقت ٹوٹنے کے بعد خیبر کے یہودی مدت سے سازشیں کر رہے تھے۔ انہوں نے قبلہ غطفان وغیرہ سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بروقت اقدام نے ان کی طاقت توڑ دی۔

صلح حدیبیہ کرنے کے ایک مہینہ کے بعد ۶۲۸ء میں آپؐ نے حدیبیہ والے اسلامی لشکر کے ساتھ خیبر کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں یہودی قلعوں کے کئی گروہ تھے لیکن آپؐ نے کچھ اس طرح ان کا محاصرہ کیا کہ بقیہ قلعے کچھ نہ کر سکے۔ یہودی سپاہ کی تعداد دس ہزار سے اوپر تھی لیکن وہ کھلے میدان میں نہ اتر سکے۔ قلعہ بند ہو کر لڑتے رہے۔ جب آپؐ نے ایک ایک کر کے ان کے

کئی قلعے فتح کر لئے تو انہوں نے اپنی سالانہ پیداوار نصف دینے کے وعدے پر صلح کر لی۔ آپؐ نے زمینیں ان کے قبضہ میں رہنے دیں اور ان سے سالانہ خراج وصول کرتے رہے۔

بعد میں انہی شرطوں پر خیبر کے قریب کی تین یہودی بستیوں..... فدک، تناء اور وادی القرئی..... نے بھی آپؐ سے صلح کر لی۔ اس مہم سے مسلمانوں کی خاص کرمینہ کے شریک مہم مجاہدوں کو سال بھر کی ضرورت کا اناج جو، جو اور کھجور وغیرہ پر مشتمل، ملتا رہا۔

قریشی طاقت کا خاتمہ:

صلح حدیبیہ کو مشکل سے دو سال گزرے تھے کہ قریش نے اپنے خاتمہ کے انتظامات کر لیے۔ انہوں نے اپنے حلیف قبیلہ بنو بکر بن مناة کو کھلی مدد دی اور دونوں نے مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر حملہ کر کے ان کے کئی لوگوں کو مار ڈالا اور ان کا مال لوٹ لیا۔ بنو خزاعہ کے وفد نے مدینہ حاضر ہو کر آپؐ سے معاہدہ حدیبیہ کی شرط کے مطابق قریش سے فصاص لینے کی درخواست کی۔ آپؐ نے قریش کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ روایت و دستور کے مطابق بنو خزاعہ کو دیت ادا کریں یا مجرموں کو قصاص کے لیے پیش کریں۔ قریش کے مغرور سرداروں نے دیت و قصاص دینے سے انکار کر کے صلح حدیبیہ ہی کے توڑ ڈالنے کا اعلان کر دیا۔ سفیر نبوی کے واپس آنے کے بعد تجربہ کار اور سمجھ دار قریشی سرداروں نے موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے ابوسفیان اموی کو مدینہ بھیجا تاکہ وہ صلح حدیبیہ کی پھر سے تجدید کر لیں۔ لیکن ابوسفیان کو آپؐ نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ مایوس مکہ لوٹ گئے۔

آپؐ نے بڑے زور و شور سے تیاریاں شروع کر دیں لیکن اپنا اصل منصوبہ پوشیدہ رکھا۔ تمام مسلم قبائل خاص کر ارد گرد کے طاقتور قبیلوں کو فوجیں تیار کر کے متعین وقت اور متعین مقام پر آملنے کے احکام جاری کیے۔ جب تیاری مکمل ہو گئی تو آپؐ ایک دوسرے نسبتاً غیر معروف راستہ سے مکہ کی طرف دس ہزار مسلح لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے جس میں دو ہزار سے زیادہ شہسوار تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی اور آپؐ نے اچانک مکہ والوں کو جالیا۔

آپؐ نے اپنی فوجوں کو چاروں طرف سے مکہ میں داخل ہونے کا حکم دیا اور مکہ والوں پر

واضح کر دیا کہ وہ اسلامی لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے لہذا ہتھیار ڈال دیں اور بلاوجہ خوں ریزی سے بچیں۔ ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ لہذا چند سر پھروں کے سوا اور کسی نے آپؐ کا مقابلہ نہ کیا۔ اور ۲۰ رمضان ۸ھ ۱۱/ جنوری ۶۳۰ء کو مکہ فتح ہو گیا اور مدینہ کو اسلامی ریاست کا ایک صوبہ بن گیا۔

آپؐ کا مقصد دشمن کو ختم کرنا نہیں تھا، صرف اس کی طاقت توڑنا تھا تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرکشی نہ کر سکے۔ وہ مقصد حاصل ہوا تو آپؐ نے سب مکہ والوں کو عام معافی دے دی۔ حضرت ابوسفیان اموی جیسے کچھ بزرگ سردار پہلے ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ فتح کے بعد پورا مکہ اور قریش کے تمام قبیلے اسلام لے آئے اور اس طرح اسلامی ریاست مکہ کی حدود تک وسیع ہو گئی اور اسلام سب ادیان غالب ہو گیا۔ (سورہ نصر اور دوسری آیات قرآنی)

ہوازن کا قبول اسلام

غزوہ حنین:

مکہ مکرمہ کے پڑوس میں طائف اور اس کی بستیاں تھیں جہاں بہت ہی طاقتور قبیلہ ہوازن اپنے عظیم خاندانوں کے ساتھ بستا تھا۔ ان میں سب سے اہم ثقیف کا قبیلہ تھا۔ وہ قریش کے دشمن تو تھے لیکن اسلام کے بھی جانی دشمن تھے۔ فتح مکہ کے بعد ان کو خوف ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب ان کے خلاف کارروائی کریں گے۔ لہذا انہوں نے دس ہزار پر مشتمل فوج حنین کی وادی میں جمع کر لی اور مکہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ آپؐ کو خبر ہوئی تو آپؐ اپنے لشکر کے ساتھ ان کے خلاف بڑھے۔ پہلی بار مسلمانوں کا لشکر بارہ ہزار تھا اور دشمن سے زیادہ تھا مسلمانوں کو کچھ غرور بھی ہو چلا تھا کہ وہ چھوٹے لشکروں کے ساتھ فتح پاتے چلے آ رہے ہیں۔ اب تو ان کی تعداد زیادہ ہے۔

مگر حنین کی وادی میں داخل ہونے کیلئے جوں ہی اسلامی لشکر کے شہسوار دستے، بنو سلیم کے قبلہ سے تھے، درہ سے اندر پہنچے ان پر ہوازن کی فوج نے سخت تیر اندازی کی۔ اچانک حملہ سے گھوڑے بدک کر بھاگے تو چند سو کے سوا پورا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر اللہ کی رحمت اور رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت قدمی سے اسلامی لشکر پلٹا اور اس نے ہوازن کو ایک کراری شکست دے کر جنگ حنین شوال ۸ھ فروری ۶۳۰ء میں جیت لی۔

ان کے چھ ہزار گھرانے اور بے شمار اونٹ، بھیڑ بکری اور مال دولت مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ چوں کہ ان قیدیوں میں آپ کے رضاعی قبیلہ بنو سعد بن بکر کے قیدی بھی تھے اس لیے آپ نے ان کو ازراہ کرم آزاد کر دیا۔ آپ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے تمام مسلمانوں نے بھی اپنے قیدی آزاد کر دیئے۔ اس کا بہت اچھا اثر ہوا اور ان کے ہزار ہا لوگ مسلمان ہو گئے۔

غزوہ طائف:

جنگ حنین کے بھاگے ہوئے سرداروں اور سپاہیوں نے شہر طائف میں پناہ لی اور محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ آپ نے ایک ماہ تک ان کا محاصرہ جاری رکھا۔ پھر مسلمانوں کے مشورہ سے اٹھالیا اور واپس مکہ چلے آئے۔ آپ نے ہجرانہ نامی مقام پر مال غنیمت تقسیم کیا۔ وہاں سے عمرے کیے اور پھر مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں بعد طائف اور ہوازن کے لوگ خود مدینہ حاضر ہو کر اسلام لے آئے۔ اور پورے علاقے پر اسلام کی حکمرانی قائم ہو گئی۔

پورے عرب کی اطاعت:

سارا عرب اس بات کا منتظر تھا کہ قریش اور اسلام کی جنگ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ جب انہوں نے دیکھا کہ مکہ مکرمہ ہی فتح ہو گیا اور عرب کی سب سے بڑی طاقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے سرنگوں ہو گئی تو انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بالادستی اور مدینہ منورہ کی برتری قبول کر لی۔ اس مقصد کیلئے پورے عرب کے طول و عرض سے مشرق و مغرب اور جنوب و شمال سے تمام قبیلوں کے وفود اور نمائندے اس کثرت کے ساتھ مدینہ آئے کہ ۹۰ھ ۳۱/۶۳۰ء عام الوفود (وفدوں کا سال) کہا جانے لگا۔ بہت سے قبیلوں نے پہلے برسوں میں بھی اپنے وفود بھیجے تھے مگر وہ اکادکا آئے تھے۔ اس سال لگاتار بہت سے وفود آئے۔ یوں تو سارے قبیلوں کے وفود ان میں شامل تھے مگر اہم ترین قبیلے یہ ہیں:

ہوازن، ثقیف، عامر بن صعصعہ، عبد القیس، طے، کندہ، ازد، ہمدان، اشعر مزینہ، جہینہ،

دوس، اسد، خزیمہ، فزارہ، اشجع اور غطفان، تجیب، ہذیم، بہرہ، عذرہ، ہلی، مرہ، غسان، سلمان، محارب، عبس وغیرہ۔

ان وفود میں سے اکثر نے اپنے اور اپنے قبیلوں کے اسلام لانے اور اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے کا اعلان کیا مگر بعض قبیلے ایسے بھی تھے جو اسلام نہیں لائے۔ انہوں نے اسلام ریاست کی ماتحتی اختیار کی اور جزیہ و خراج ادا کیا۔ اس طرح وہ اسلامی حکومت کے ذمی بن گئے۔

جزیرۃ العرب پر اسلام کی حکمرانی:

اکثر قبیلوں نے تو اسلام کی بالادستی قبول کر لی تھی لیکن بعض خاندانوں، علاقوں اور قبیلوں نے شورش و فتنہ جاری رکھا۔ ان کی سرکوبی کے لیے آپؐ نے چھوٹی بڑی کئی مہمیں بھیجیں۔ فتح مکہ اور آپؐ کی وفات کے درمیان دو سو دو برسوں میں یعنی ۸ھ تا ۶۳۰ھ اور ۱۱ھ تا ۶۳۲ھ کے درمیان کل گیارہ سرایا و غزوات مختلف علاقوں میں بھیجے گئے۔ ان میں سے کئی تبلیغی اور اصلاح جماعتیں تھیں، فوجی نہ تھیں۔ ان میں سے بعض مشہور بت خانوں کو توڑنے کیلئے بھیجی گئی تھی۔ جیسے حضرت ابوسفیان اموی اور مغیرہ بن شعبہ کی مہم لات کا بت توڑنے کیلئے، حضرت علی ہاشمی کا سریہ فلس قبیلہ طے کے معبود باطل کی شکست کے لیے، حضرت خالد بن ولید کی مہم نخلہ غریٰ شکنی کیلئے، حضرت عمرو بن عاص کی مہم سواع نامی بت توڑنے کے لئے اور ایسی ہی کئی مہمیں تھیں۔

غزوہ تبوک:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی سب سے بڑی مہم یا غزوہ تبوک تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ رومی / بازنطینی سلطنت کا حکمران قیصر روم ہرقل HERACLEUS شامی سرحد پر بے ہوئے عرب قبیلوں غسان، عذرہ، ہلی اور قضاء کی مدد سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ آپؐ کو جیسے ہی خبر ملی آپؐ نے مسلمانوں کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ اور خلاف معمول معہم کا نام بھی بتا دیا۔ آپؐ کے حکم پر بہت سے مسلمانوں نے مال دیا، جانور اور اسلحے دیئے اور خوب تیاری کی اور تیس ہزار لشکر جرار تیار ہو گیا جس میں دس ہزار شہسوار تھے۔ لیکن یہ

سخت گرمی اور فصل پکنے کا زمانہ تھا۔ بہت سے مخلص مسلمان بھی اس میں شرکت کیلئے آمادہ نہ تھے لیکن وہ بادل نخواستہ چلے ہی گئے۔ کچھ البتہ شریک نہ ہوئے اس پر ان کی سخت تادیب ہوئی۔ آپؐ کوچ پر کوچ کرتے ہوئے شامی سرحد کے قریب تبوک نامی مقام تک پہنچے اور وہاں ایک ماہ تک دشمن کا انتظار کیا مگر وہ آپؐ کے اقدام سے گھبرا کر نہ آیا۔ آپؐ یہ غزوہ تبوک تھا جو ۹ھ ۶۳۱ء میں بلا جنگ وجدل کامیاب رہا۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ کے شمال میں سرحد تک پھیلے ہوئے علاقے میں تمام قبیلوں نے یا تو اسلام قبول کر لیا یا اسلامی ریاست کو جزیہ ادا کرنے کا معاہدہ کر کے اس کے ذمی بن گئے۔ جزیہ ادا کرنے والی بستیوں میں دومتہ الجندل، ایلہ وغیرہ کی عیسائی بستیاں اور ان کے حکمران شامل تھے اور جرباء مقنا اور ذات اذرح کی یہودی بستیاں اور ان کے شہری بھی۔ بعض عرب قبیلوں نے بھی جزیہ دینا شروع کیا۔

سریہ اسامہ:

آپؐ کی حیات طیبہ کی آخری بڑی مہم حضرت اسامہ بن زید کا سریہ تھا جسے آپؐ فلسطین کے علاقے میں بھیجنا چاہتے تھے۔ اس کو روانہ بھی کر دیا تھا مگر اسی دوران آپؐ کی بیماری نے سختی پکڑ لی اور آپؐ کی وفات ہو گئی جس کے سبب وہ مہم آپؐ کی زندگی میں نہ جاسکی۔ آپؐ کی مدنی زندگی کے دس برسوں پر پھیلی ہوئی مہم جوئی اور سخت محنت کی وجہ سے اسلامی ریاست پورے جزیرۃ العرب پر قائم ہو گئی اور اس کی اکثریت اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی۔

اسلامی ریاست کا نظام حکومت

اسلامی ریاست کی بنیاد:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی دس سالہ زندگی میں جس اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور اسے مضبوطی عطا کر کے اسے پہلی ملک گیر ریاست بنادیا اس کی بنیاد دراصل اسلام پر تھی۔ آپؐ کا اصل کام اللہ کے دین کو پھیلانا اور انسانوں کو اللہ کی حکمرانی میں داخل کرنا تھا۔ سماج و معاشرہ اور حکومت و ریاست اس کا پھل تھے جو خود بخود اسلام کے قیام و اشاعت کے ساتھ آتے ہیں۔ جہاں جہاں اسلام پھیلتا وہاں وہاں اسلامی حکومت اور اسلامی ریاست خود بخود قائم ہوتی جاتی۔ لہذا دین اصل ہے اور باقی چیزیں اس کا ثمرہ اور نتیجہ ہیں لیکن ان کے لئے اصل دین کا قیام ضروری ہے۔

اسلامی ریاست کا مقصد:

اسلامی ریاست و حکومت کا مقصد یہ ہے کہ زمین میں اللہ کی حکمرانی اور فرمانروائی قائم کی جائے۔ یہ حکمرانی اور فرماں روائی اللہ کے بتائے ہوئے تمام احکام پر سچے دل کے ساتھ عمل درآمد سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام انسان کی زندگی کے ہر میدان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کا کوئی کام ان کے دائرہ سے باہر نہیں چاہے زندگی مذہبی ہو یا تمدنی اور تہذیبی اس کا تعلق سیاست ہو یا انتظام سے۔ اللہ کی اسی جامع و ہمہ گیر حکمرانی کا نام دین و شریعت ہے۔ ریاست

وحکومت اس کا شعبہ ہے۔

دین کا سیاسی شعبہ یا اسلامی نظام حکومت قائم کرنا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسانی سماج کو اجتماعی انصاف نہیں مل سکتا۔ صرف یہی وہ نظام حکومت ہے جو عالم الغیب والشہادۃ اور رحمن ورحیم اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے جس میں اس کے تمام بندوں کی بھلائی موجود ہے۔ باقی تمام نظام انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں جس میں بعض خاص طبقوں کے فائدے ہی فائدے ہیں اور بقیہ کا نقصان ہی نقصان۔ قرآن مجید میں واضح کیا گیا ہے کہ اگر اللہ والوں کو زمین میں حکومت و اقتدار مل جائے تو نمازیں قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں (سورہ حج ۴۱)۔ یہ صرف مذہبی امور کو قائم کرنے کا معاملہ نہیں بلکہ تمام لوگوں کو شریعت کے مطابق ان کے حقوق اور دین کے مطابق تمام فرائض ادا کرنے کا معاملہ ہے۔ اسی سے اجتماعی انصاف پیدا ہوتا ہے اور سب کی زندگی اچھی گزرتی ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے۔

مدینہ کی اسلامی ریاست:

مدینہ منورہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دین و شریعت کی بنیادوں پر ریاست و حکومت قائم کی تو اسی مقصد و مقصود اور طریقہ کو سامنے رکھا۔ فکری اور نظریاتی طور پر اگاہ کیا کہ حکمرانی یا اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس میں انسان کو کوئی حصہ حاصل نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور نمائندہ کی حیثیت سے اس کے احکام و اوامر کے مطابق حکومت کرتے ہیں اور آپ کے بعد مسلمانوں کا جو بھی حکمران ہوگا اس کو آپ کے جانشین یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کی حیثیت حاصل ہوگی اور وہ اللہ و رسول کے احکام کے مطابق مسلمانوں کے مشورہ سے سب کی بھلائی کے لیے حکومت کا کام چلائے گا۔

مقام رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

آپ کو چونکہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے ایک امتیازی وصف یہ حاصل تھا کہ آپ وحی کے ذریعہ اللہ کے احکام براہ راست حاصل کرتے تھے۔ اس لیے آپ

کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ ان پر صرف قرآن مجید اور وحی کی پابندی عائد تھی۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ ان پر صرف قرآن مجید اور وحی کی پابندی عائد تھی۔ ظاہر ہے کہ آپؐ فرمان الہی کے مطابق کام کرتے تھے اور اپنی خواہش نفس اور انسانی جذبات سے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ (سورہ نجم ۴-۳) اس لیے آپؐ کو اسلامی ریاست و حکومت کے تمام اختیارات و مناصب حاصل تھے۔ آپؐ سربراہ ریاست ہونے کے ساتھ سربراہ حکومت بھی تھے۔ شہری نظم و نسق کے اعلیٰ ترین عہدے دار تھے، تو فوج کے سپہ سالار اعلیٰ تھے۔ قانون سازی کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھے اور عدل و انصاف کے سب سے بڑے حاکم تھے۔ صرف آپؐ ہی مستقل حاکم و سردار، سپہ سالار و قاضی اور سربراہ تھے باقی آپؐ کے عطا کردہ اختیارات کے سبب منصب دار و عہدہ دار بنتے تھے اور عارضی ہوتے تھے۔ بحیثیت انسان اور بحیثیت معلم آپؐ تنہا سارے کام نہیں انجام دے سکتے تھے۔ اس لیے آپؐ نے اپنی مدد اور امت کی عملی رہنمائی کیلئے ریاست و حکومت کے مختلف شعبوں میں اپنے مددگار اور عہدہ دار مقرر کیے۔ نظریاتی طور سے یہ تمام مددگار و عہدہ دار عارضی تھے اور آپؐ کی خوشنودی کے دوران ہی کام کرتے تھے۔ ان کا کوئی حق منصبی نہ تھا۔ آپؐ جب چاہتے اور جسے چاہتے کسی مصلحت و خیر سے مقرر کر سکتے تھے یا ہٹا سکتے تھے، کسی کو اس پر اعتراض کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ تاہم آپؐ اکثر کام مسلمانوں کے اہل الرائے طبقہ کے مشورے ہی سے کرتے تھے۔

مجلس شوریٰ:

قرآن مجید کے حکم اور آپؐ کی سنت نے شوریٰ (مشورہ کرنے) کو اسلامی نظام حکومت کا دوسرا اہم ترین اصول بنا دیا ہے۔ اس کے بغیر صحیح اسلامی نظام حکومت قائم نہیں ہو سکتا اور نہ چل سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں سے اور ہر کس و نا کس سے مشورہ کرنا ضروری نہیں ہے اور نہ ممکن ہے، کیوں کہ تمام مسلمان یا تمام انسان ہر کام کے اہل نہیں ہوتے، اس لیے حکومت و حکمرانی کے کاروبار میں صرف ان لوگوں سے مشورہ کرنا ضروری ہے جو صاحب رائے ہوں اور حکومت کے معاملات کو سمجھتے بوجھتے ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شورشی کے سلسلہ میں یہ سنت قائم کر دی کہ صرف اصحاب رائے سے مشورہ کرتے۔ عام مسلمانوں یا مشیروں میں سے کوئی صحیح مشورہ دیتا تو اس کو خوشی سے مان لیتے۔ اجتماعی مشورے کو اکثر و بیشتر تسلیم کر لیتے خواہ آپؐ کی رائے کے خلاف ہو جیسا کہ جنگ احد کے موقع پر ہوا تھا۔

نازک فیصلوں میں اپنا حق اختیار استعمال فرماتے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتے۔ بلکہ مشورہ تک نہ کرتے کہ اس میں بہتری کے بجائے نقصان کا خطرہ زیادہ تھا۔ آپؐ کے مشیر سب کے سب مدینہ منورہ کے باشندے تھے۔ یہ معمول نبوی تھا۔ دوسرا معمول یہ تھا کہ مشیروں کا انتخاب آپؐ خود فرماتے تھے۔ وقت ضرورت سب سے مشورہ کرتے مگر عام مشورہ لازمی نہ تھا۔

مشیران نبوی:

آپؐ کے خاص مشیروں میں اہم ترین حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق تھے۔ ان سے ہر کام میں مشورہ کرتے اور ان کے مشوروں کو قبول کرتے تھے کہ وہ مزاج دانان شریعت و رسالت تھے۔ دونوں آپؐ کے ہمہ وقت صحابی اور ساتھی تھے۔

ان کے علاوہ دوسرے مشیروں میں یہ حضرات شامل تھے: حضرت سعد بن معاذ اوسی، حضرت سعد بن عبادہ خزرجی، حضرت اسید بن حضیر خزرجی، حضرت حباب بن منذر (جو آپؐ کے جنگی معاملات کے اہم ترین مشیر تھے)، حضرت سلمان فارسی، حضرت نوفل بن معاویہ دہلی، حضرت عثمان بن عفان اموی، حضرت علی ابن طالب ہاشمی، حضرت زید بن حارثہ کلبی، حضرت نعمان بن مالک اوسی، حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی اور متعدد دوسرے حضرات۔ آپؐ کے کل مشیروں کی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے۔

خلفاء یا نائبین نبوی:

آپؐ غزوات و سرایا اور حج عمرہ کے سلسلے میں مدینہ منورہ سے برابر باہر جاتے رہتے تھے چوں کہ مدینہ کو سربراہ حکومت کے بغیر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ اس لیے آپؐ ہمیشہ اپنی غیر موجودگی کے زمانہ کیلئے ایک نائب چھوڑ جاتے تھے، بسا اوقات وہ ایک سے زیادہ بھی ہوتے

تھے، یہ نائب رسول یا خلیفہ رسول کہلاتے تھے۔

جنگ بدر کے موقعہ پر آپؐ نے تین تین نائب چھوڑے تھے۔ حضرت ابولبابہ، حضرت عامر بن عدی اور حضرت حارث بن حاطب آپؐ کے سب سے اہم خلیفہ آپؐ کے صحابی حضرت عمرو بن مکتوم تھے جن کو آپؐ نے کم از کم تیرہ مرتبہ اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ باقی اہم خلفاء اناسین میں حضرات زید بن حارثہ کلبی، عثمان بن عفان اموی، ابوسلمہ، عبدالاسد مخزومی، سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی، عبداللہ بن رواحہ خزرجی، محمد بن مسلمہ اوسی اور سباع بن عرفطہ غفاری تھے۔ کل تیرہ، خلفاء کے نام ملتے ہیں۔

کاتبین نبوی:

حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے آپؐ کو بہت سے احکام و فرائین لکھوانے ہوتے تھے اس لئے آپؐ نے کاتبوں کی ایک بڑی تعداد سے مختلف اوقات میں کام لیا۔ ایک انداز کے مطابق ان کی تعداد چالیس ہے۔ ان میں سے کچھ کاتب خاص قرآن مجید کی کتابت کیلئے تھے اور بعض قرآن مجید کے علاوہ دوسرے سرکاری امور کی کتابت کرتے تھے۔

قرآن مجید کے کاتبوں کا کام مکئی عہد سے شروع ہو گیا تھا۔ ان میں حضرات ابوبکر، عمر عثمان اور علی کے علاوہ حضرات شرجیل بن حسنہ کنڈی، ابی بن کعب خزرجی، زید بن ثابت خزرجی، معاذ بن جبل خزرجی، معاویہ بن ابی سفیان اموی وغیرہ اہم ترین تھے۔

دوسرے سرکاری امور و فرائین لکھنے والوں میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی حضرت زید بن ثابت خزرجی، حضرت عبداللہ بن ارقم مخزومی، حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی، حضرت خالد بن سعید اموی، حضرت حنظلہ بن سہیل نجفی، حضرت یزید بن ابی سفیان اموی، حضرت مغیرہ بن شعبہ ثقفی وغیرہ ممتاز ہیں۔ ان میں سے اکثر مستقل کاتب تھے اور کچھ عارضی۔ مستقل کاتبوں میں حضرت ابی بن کعب خزرجی، حضرت زید بن ثابت خزرجی اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی تھے۔

سفراء نبوی:

عرب قبیلوں کے سرداروں اور اسلامی ریاست کے پڑوسی حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دینے اور اسلامی ریاست کے ساتھ ان کا تعاون حاصل کرنے کیلئے بہت سے سفیروں کو بھی آپؐ نے وقتاً فوقتاً مقرر کیا تھا۔ یہ سب کے سب کسی خاص مہم کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کی کل تعداد چوالیس تک پہنچتی ہے۔ ذیل میں بعض اہم ترین سفیروں اور ان کی منزلوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ حضرت محمد بن مسلمہ اوسی، حضرت سعد بن معاذ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ یہودی بنی نضیر اور بنی قریظہ کیلئے۔

۲۔ حضرت خزاش بن امیہ خزاعی، حضرت عثمان بن عفان اموی اور حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش سے گفتگو کیلئے۔

۳۔ غیر ملکی حکمرانوں کے دربار میں سفراء نبوی: حضرت وحیہ بن خلیفہ کلبی، (قیصر روم)، حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی (کسرائے ایران) حضرت عمرو بن امیہ ضمری، (بخاشی حبشہ) حضرت حاطب ابی بلتعہ نخعی (مقوقس مصر)، حضرت شجاع بن وہب اموی (حاکم غسان) حضرت سلیط بن عمرو عامری (قبائل یمامہ) حضرت عمرو بن عاص سہمی (شاہ عمان)، حضرت علاء بن حضرمی (بادشاہ بحرین) حضرت مہاجر بن امیہ مخزومی (شاہ یمن)۔

قضاۃ:

اسلامی ریاست کے مرکزی نظام حکومت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مذکورہ بالا عہدیداروں کے علاوہ بعض اور عہدے بھی قائم کئے گئے تھے۔ ان میں ایک قاضی کا بھی تھا۔ آپؐ کے زمانے میں صحابہ کرام کی پوری ایک جماعت مقدمات کے فیصلے کیا کرتی تھی۔ ان میں حضرت عمر اور حضرت علی مستقل قاضی تھے۔ بعض مواقع پر آپؐ نے حضرت معقل بن یسار اور حضرت عقبہ سے اپنی موجودگی میں فیصلے کرائے تھے۔

مفتیان گرامی:

عہد نبوی میں اسلامی قانون شریعت کے کچھ ایسے ماہرین صحابہ کرام تھے جو فتوے دیا

کرتے تھے۔ ان میں سے آٹھ بہت اہم تھے: حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی عبدالرحمن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور زید بن ثابت۔

دوسرے افسران نبوی:

بعض مواقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرکز سے قانون اسلامی نافذ کرنے کیلئے افسر بھیجے تھے: مثلاً حضرت سعد بن معاذ اسی کو بنو قریظہ کے معاملہ میں حکم بنایا۔ حضرت علی کے ذریعہ بنو جذام کے مقتولوں کا قصاص ادا کرایا، حضرت ابوامامہ نے خون کھانے کی تحریم کا اعلان کیا، حضرت علی نے سورۃ برأت التوبہ کا اعلان کیا حضرات مالک بن الدخشم، معن بن عدی اور عاصم بن عدی نے مسجد ضرار منہدم کی اور حضرت انیس بن ضحاک نے ایک زانیہ کو رجم کی سزا دی آپؐ نے مدینہ منورہ کیلئے ایک بازار کا افسر بھی مقرر کیا تھا جو حضرت عمرؓ تھے۔ فتح مکہ کے بعد حضرت سعید بن سعید اموی کو مکہ کے بازار کا افسر بنایا۔ ان کے علاوہ بعض دوسرے بازاروں کے افسر بھی تھے۔ آپؐ خود براہ راست اکثر بازار مدینہ کا دورہ کر کے اس کے انتظام و نگرانی کا کام کیا کرتے تھے۔

شعراء و خطباء نبوی:

عرب معاشرہ میں شاعر اور خطیب رائے عامہ بنانے، بیدار کرنے یا بگاڑنے میں بڑا کردار ادا کرتے تھے کہ شاعری عربوں کی زبان اور خطابت اس کی جان تھی۔ آپؐ نے اسلام کے دفاع اور اسلامی ریاست کی حفاظت کیلئے شاعروں اور خطیبوں کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ آپؐ کے تین مستقل شاعر تھے، حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن مالک اور حضرت عبداللہ بن رواحہ اور آپؐ کے سب سے بڑے خطیب حضرت ثابت بن قیس تھے۔ ان سب کا تعلق مدینہ اور قبیلہ خزرج سے تھا۔ یہ شعراء و خطباء اسلام کی حفاظت کرتے اور اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہونے والے حملوں کا جواب دیتے تھے۔

متفرق ماتحت کارکن:

بعض چھوٹے کارکنوں کا ذکر بھی ملتا ہے جیسے آذن (اجازت دینے والا) جس کا کام تھا

کہ آپؐ کی اجازت کے بغیر کسی کو آپؐ سے بعض خاص حالات میں نہ ملنے دے۔ اسی کا دوسرا نام بواب (چوکیدار۔ وہلیز اور واہ کا نگراں) بھی آیا ہے۔ بسا اوقات وہ صاحب بھی کہلاتا ہے جو بعد میں بڑا عہدہ بن گیا۔ حضرت بلال بن رباحؓ نے واقعہ ایلا کے زمانے میں آپؐ سے لوگوں کو نہیں ملنے دیا۔ حضرت عبداللہ بن زمعہؓ اسدی آپؐ کے مستقبل دربان تھے۔ ان میں حضرت بلال حبشی بہت اہم تھے کہ وہ آپؐ کے خازن سکرٹری اور مستقل خادم تھے۔

صوبائی نظام حکومت:

والی: اسلامی ریاست ایک مرکزی حکومت تھی جس کو بہت سے صوبوں (ولایات) میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ صوبے مرکز حکومت..... مدینہ..... کی مانند اپنا نظام رکھتے تھے۔ ہر صوبہ کا سب سے بڑا افسر والی (گورنر) ہوتا تھا جس کا تقرر آپؐ براہ راست کرتے تھے۔ والی یا گورنر فوجی، عدالتی، مالی اور مذہبی ہر طرح کے ملکی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ اپنے صوبہ کا قاضی اور جج، مفتی امام، سپہ سالار، صدقات کا افسر وغیرہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔ وہ مستقل افسر ہوتا تھا اور اپنی خدمات کے عوض تنخواہ پاتا تھا۔ اہم گورنر اور ان کے صوبوں کے نام یہ ہیں:

- ۱۔ حضرت یزید بن ابی سفیان اموی (قیام) ۲۔ حضرت عبداللہ بن سعید اموی (قریٰ)
- عربیہ) ۳۔ حضرت عمرو بن سعید اموی (وادی القریٰ) ۴۔ حضرت سواد بن غزیہ خزرجی (خیبر)
- ۵۔ حضرت عتاب بن اسید اموی (مکہ مکرمہ) ۶۔ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی (طائف)
- ۷۔ حضرت حارث بن نوفل ہاشمی (جدہ) ۸۔ حضرت شرجیل بن حسنہ کنڈی (ایلہ و شمالی علاقے)
- ۹۔ حضرت علماء بن الحضری (بحرین) ۱۰۔ حضرت ابان بن سعید اموی (بحرین)۔ حضرت علماء کے بعد) ۱۱۔ حضرت عمرو بن العاص (عمان) اور ۱۲۔ حضرت معاذ جبل خزرجی (جنوبی عرب کے گورنر جنرل)۔ ان کے ماتحت گورنر تھے۔ حضرت خالد بن سعید اموی (صنعاء) حضرت عمرو بن حزم خزرجی (نجران)، حضرت ابوسفیان بن حرب اموی (جرش) حضرت ابو موسیٰ اشعری (جنوبی مغربی ساحل)۔

ان کے علاوہ بھی کچھ اور والی گورنر ہوئے تھے جن کو مختلف علاقوں کی فتح یا موجودہ گورنر کی

مغزولی کے بعد مقرر کیا گیا تھا۔ سوائے ایک دو کے باقی تمام گورنرز مستقل رہے کہ وہ آپؐ کی حیات مبارکہ کے آخر تک اپنے عہدوں پر برقرار رہے ان گورنروں یا والیوں کو اختیار تھا کہ وہ انتظامی امور کو انجام دینے کے لئے بعض ماتحت افراد رکھ سکتے تھے۔ ان میں قاضی، مفتی، خراج کے وصول کرنے کے افسر اور مقامی منتظم وغیرہ شامل تھے۔

مقامی انتظامیہ:

عرب کے قبائلی نظام کے پیش نظر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلوں، خانوادوں اور خاندانوں کے سرداروں کو ان کے اپنے اپنے علاقوں کا انتظار و انصرام سونپ دیا تھا۔ ان میں سے اکثر مسلمان قبیلوں کے سرداروں کو آپؐ نے ان کے عہدوں پر برقرار رکھا تھا مگر بعض نئے سردار بھی مقرر کئے تھے۔ وہ امن و امان، فوجی انتظامات، مذہبی امور، عدل و انصاف اور مرکزی حکومت کے احکام کے نفاذ کے ذمہ دار تھے۔ وہ اپنے اپنے صوبوں کے حکام کی مدد کرنے اور مرکزی حکومت کے وفادار رہنے کے پابند تھے۔ ایک طرح سے وہ مرکزی اور صوبائی حکومت کے مقامی ذمہ دار تھے۔

دوسری بیعت عقبہ میں آپؐ نے اسی غرض سے مدینہ شہر کے لیے بارہ نقیب مقرر کیے تھے جن کے سردار حضرت اسعد زرارہ خزرجی تھے۔ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد بھی آپؐ نے ان کو برقرار رکھا تھا۔ حضرت اسعد کے انتقال کے بعد آپؐ نے بنفس نفیس نقیب البقاء کا عہدہ سنبھال لیا کہ اب مدینہ شہر کے آپؐ ہی سب سے بڑے حاکم تھے۔

فوجی اور مالی تنظیم

فوجی تنظیم

تعبیہ نظام:

جاہلی عرب میں بعثت نبوی سے پہلے تقریباً ایک صدی قبل متمدن اور شہری عربوں خاص کر قریش مکہ نے پرانے عرب طریقہ جنگ ”الکر والقر“ (حملہ کرنا اور بھاگ جانا) کو چھوڑ کر عجمی طریقہ جنگ تَغْيِيہ اختیار کر لیا تھا۔ اس تنظیم میں فوج پانچ حصوں مقدمہ (VANGUARD) قلب (CENTRE) میمنہ (RIGHT WING) میسرہ (LEFT WING) اور موخرہ یا ساقہ (REAR GUARD) میں منقسم ہوتی تھی۔ اسی بنا پر فوج کا نام ہی ”انخمیس“ پڑ گیا کہ وہ پانچ بازوؤں والی ہوتی تھی۔ طریقہ جنگ ”زحف“ اور ”صف“ تھا کہ قطاروں میں منظم ہو کر لڑتی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نظام جنگ کو اتنا مضبوط و مستحکم کیا کہ وہ چند برسوں میں عرب کی بہترین فوج بن گئی۔

اسلامی فوج:

اسلامی آبادی کا کوئی خاص حصہ فوج کیلئے مخصوص نہیں تھا بلکہ پوری بالغ مرد آبادی اسلامی فوج تھی۔ وقت ضرورت آپؐ کے حکم پر ہر قبیلہ اپنا اپنا مقررہ حصہ اسلامی فوج کی تشکیل کرنے کیلئے

بھیج دیتا تھا اور مہم کے خاتمہ کے بعد ہر قبائلی دستہ اپنے علاقہ کو واپس ہو جاتا تھا اور امن و امان کا کام کرتا تھا۔ شروع میں اسلامی فوج کی تعداد بہت کم تھی اور جنگ بدر میں صرف سواتین سو پیدل سپاہی تھے اور شہسوار تو کل دو تھے لیکن اللہ کے حکم سے آپؐ نے اسلامی فوج کی طاقت بڑھانی شروع کی اور جنگ تبوک تک اس کی تعداد تیس ہزار سپاہی اور دس ہزار گھوڑوں تک پہنچ گئی۔

عرب جاہلی فوج کی مانند اسلامی فوج کے تین اہم ڈویژن ہوتے تھے، ۱۔ پیدل (مشاہ) فوج۔ ان کو رجاں بھی کہا جاتا تھا اور یہ میدان جنگ میں پیدل لڑتی تھی۔ ۲۔ شہسوار (فرسان الخلیل) جو گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر لڑتے تھے۔ ۳۔ تیر انداز دستہ (رماۃ) جو خاص دستہ ہوتا تھا اور تیر و کمان سے مسلح ہو کر دشمن پر حملہ کرتا تھا۔ ۴۔ بعد میں آپؐ نے دبابہ اور منجنیق جیسے قلعہ شکن آلات استعمال کیے تو ان پر بھی ایک دستہ مشتمل ہوتا تھا۔ عام طور پر ہتھیاروں میں تلوار، ڈھال تیر کمان، نیزے، حربے اور خنجر وغیرہ تھے۔

امرائے افواج: امرائے سرایا:

ان تمام دستوں کے اپنے اپنے امیر یا کماندار ہوتے تھے جو ایک خاص مہم کے لیے ہی مقرر کیے جاتے تھے اور مہم کے خاتمہ کے بعد ان کا تقرر ختم ہو جاتا تھا۔ دوسری مہم میں دوسرے امیر یا کماندار مقرر ہوتے تھے۔ خمیس لشکر کے چاروں، بازوؤں..... میمنہ میسرہ، مقدمہ اور موخرہ..... کے امیر اور سردار پوری فوج کے امیر الحیش یا سپہ سالار کے ماتحت ہوتے تھے جو قلب میں رہتا تھا غزوہ میں امیر الحیش خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تھے اور سریہ میں آپؐ کا نائب کوئی صحابی۔

امرائے سرایا یا دشمنوں کے کمانداروں کا تقرر صرف فوجی لیاقت اور صلاحیت کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ تمام فوجیوں پر ان کی اطاعت فرض تھی۔ جنگ کی تمام تدابیر وہ اپنے مشیروں کے مشورے کے بعد اختیار کرتا تھا۔ وہ مہم کے دوران نماز اور دوسرے دینی معاملات کے بھی امیر ہوتے تھے۔ ان کو اور فوجیوں کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے۔

اگر کچھ مال غنیمت ملتا تو اس میں ان کو فوجیوں کے برابر حصہ ملتا تھا۔ مال غنیمت کے

پانچ حصہ کیے جاتے تھے: چار اس مہم کے فوجیوں میں تقسیم ہوتے اور پانچوں (فہم) ریاست اسلامی کا حصہ ہوتا تھا جس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صوابدید اور مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق خرچ کرتے تھے۔ اسلحہ کے افسر اور گھوڑوں کے افسر الگ مقرر کیے جاتے تھے۔

حفاظتی فوج کے افسر؟

اسلامی فوج کی حفاظت اور نگرانی کیلئے ایک محافظ دستہ مقرر کیا جاتا جس کو ”الحرس“ کہتے تھے اور اس کا ایک افسر ہوتا تھا جو الحارس یا صاحب الحرس کہلاتا تھا۔ فوج جب قیام کرتی تھی تو اس کا ایک سالار خیمہ گاہ (امیر لعکر) ہوتا تھا جو عام طور سے امیر الجیش یا سپہ سالار ہی ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنا نائب بھی مقرر کرتا تھا۔

علمبردار

اسلامی فوج مختلف قبیلوں کے دستوں پر مشتمل ہوتی تھی اور ہر قبائلی دستہ کا ایک پرچم بردار / علمبردار (صاحب الریۃ) ہوتا تھا۔ عام طور سے مہاجرین کا ایک علمبردار ہوتا تھا۔ اور خزر ج وادس کا بھی ایک ایک۔ اسلامی فوج میں شامل ہر قبائلی دستہ کا ایک علمبردار ہوتا تھا کبھی کبھی بڑے دستوں کے کئی کئی علمبردار ہوتے تھے جن کا تقرر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ ان سب سے بڑا پوری اسلامی فوج کا ایک علمبردار (صاحب اللواء) ہوتا تھا جو قلب جیش میں رہتا تھا۔

فوجی جاسوسی نظام:

فوجی نظام میں جاسوسی اور خبر گیری کا عمدہ انتظام ضروری تھی۔ اس کیلئے جاسوس (عیون) اور معلومات حاصل کرنے کے دستے (طلیعہ اطلاع) مقرر کیے جاتے تھے جو دشمن کا پتہ لگانے، ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے علاوہ پانی، خیمہ گاہ وغیرہ کا انتظام کرتے تھے۔ جاسوسی اور طلیعہ کیلئے ایک شخص سے لے کر پورے دستہ اور غیر معروف لوگوں کو مقرر کیا جاتا تھا۔

راہبر یا دلیل:

چونکہ عرب میں راستے اور شاہراہیں نہ تھیں اور جو تھیں وہ اتنی مشکل اور پرہیز تھیں کہ ان پر بلا معلومات کے سفر کرنا خطرناک تھا۔ اس لیے ہر سفر کے لئے راہبر یا گائیڈ (دلیل) کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ اسلامی فوج ہمیشہ کسی راہبر و دلیل کی رہنمائی میں سفر کرتی تھی۔

مال غنیمت کا افسر:

دشمن پر فتح حاصل کرنے کے بعد اگر مال غنیمت ملتا تھا تو اس کی نگرانی کیلئے ایک مال غنیمت کا افسر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ اسی طرح قیدیوں کیلئے بھی ایک افسر ہوتا تھا۔ غزوات میں مال غنیمت کی تقسیم اور خمس کی تعیین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے تھے۔ مال غنیمت کا افسر صرف نگرانی کرتا تھا۔ سرایا میں فیصلہ اور تقسیم کا کام امیر سریہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔

حارس:

جنگ و امن دونوں زمانوں میں اسلامی فوج کے سالار اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حفاظت کیلئے ایک شخص پر مشتمل یا کئی اشخاص اور دستہ پر مشتمل ایک محافظ جسم دستہ (BODY GUARD) ہوتا تھا۔ آپؐ نے خود اس کا تقرر کیا، آپؐ کے جاں نثار خاص کر انصاری قبیلوں اور خزرج کے افراد زیادہ تر یہ فرض اپنی تمام طرف سے انجام دیتے تھے۔

کل غزوات و سرایا:

عہد نبوی میں ایک اندازے کے مطابق کل نوے مہمیں واقع ہوئیں جن میں سے صرف ۲۷ غزوات تھے اور ۶۳ سرایا۔ دس سال پر پھیلے ان غزوات و سرایا میں ایک مطالعہ کے مطابق کل نوے غزوات میں جنگ و جدال کی نوبت آئی۔ ان میں دشمنوں کے کل دو سو سولہ افراد مارے گئے اور صرف ۱۳۸ مسلم شہید ہوئے۔ سرایا میں سے اکثر میں جنگ و جدال نہیں ہوا۔ صرف چند میں ہوا۔ اسی طرح ہر مہم میں مال غنیمت نہیں ملا۔ بہت کم مہموں میں ملا۔ دس سال کی جنگی کارروائیوں میں زیادہ سے زیادہ ایک ہزار افراد مارے گئے۔

اس کا سبب یہ تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً ہتھیار اٹھائے تھے۔ آپؐ کا مقصد دشمن کو مارنا، قتل کرنا یا جھکانا نہ تھا بلکہ اسلام میں محبت و رحمت کے ساتھ داخل کرنا تھا کہ آپؐ سراپا رحمت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کم سے کم خوں ریزی ہوئی جس دشمن نے بھی ہاتھ روک لیا آپؐ نے اس کو معاف کر دیا۔ اسلام لے آیا تو سارے جرائم اور گناہ بخش کر سینے سے لگالیا۔ آپؐ کی فوج تنظیم امن و امان قائم کرنے کیلئے تھی، ظلم و زیادتی کے خاتمہ کیلئے تھی۔ اسلام پھیلانے یا خوں ریزی کرنے کیلئے نہ تھی۔ اسلام تو اپنی سچائی، مسلمانوں کے کردار اور آپؐ کی رحمت سے پھیلا۔

مالی نظام

بنیادی فکر:

ہر نظام حکومت اور معاشرہ کو چلانے کیلئے مالی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اسلامی معاشرہ کا مالی نظام بنیادی طور سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ دونوں میں ہی باہمی تعاون یا چندے پر قائم تھا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) اللہ کو قرض دینے، اللہ کے ہاتھ تجارت کرنے اور مالی جہاد وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ ضرورت کے وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے صدقات و خیرات دینے کو فرماتے اور ہر شخص اپنی بساط بھر بلکہ اکثر حالات میں اس سے زیادہ اسلامی فنڈ میں عطیہ دیتا اور ضروری کام نکل جاتا۔ اسلام نے اخوت و بھائی چارے اور ہمدردی کے جو جذبات پیدا کئے تھے وہ از خود لوگوں کو اپنے بھائیوں کو مدد کرنے پر اکساتے تھے۔

عطیات:

مکہ مکرمہ میں حضرت ابوبکر، حضرت خدیجہ، حضرت عثمان، حضرت عمر اور بہت سے دوسرے حضرات و خواتین نے باہمی تعاون و امداد کے ذریعہ اسلامی معاشرہ کے مالی معاملات چلانے میں تعاون کیا تھا۔ مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد انصار کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج نے بے مثال قربانی، اخلاص اور اخوت کا مظاہرہ کر کے اپنے مہاجر بھائی بہنوں کو اپنی زمینوں، باغوں اور مالوں

میں حصہ دار بنایا تھا ان کو رہنے کیلئے گھریا آراضی دی تھی، کاروبار کے لئے آراضی اور مال دیا تھا اور پیداوار میں شریک کیا تھا۔ غرضیکہ بے مثال فیاضی و سخاوت کا نمونہ پیش کیا تھا۔

دوسری طرف مہاجرین نے اپنے انصاری بھائیوں کا ان کے کاروبار میں ہر طرح ساتھ دیا اور اسے بڑھایا تھا اور بعد میں جوں جوں ان کو موقع ملا وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے گئے اور اپنے انصاری بھائیوں پر بوجھ نہیں بنے رہے۔

اسلامی ریاست اور مسلمانوں کی مدد کیلئے جب بھی مطالبہ کیا گیا، انصار اور مہاجرین دونوں نے عطیات دیئے یہ عطیات نقد و جنس پر بھی مشتمل ہوتے تھے اور جائیداد و آراضی پر بھی غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت ابوبکر نے اپنی پوری دولت اور حضرت عمر نے آدھی دولت دیدی تھی۔ جب کہ حضرت عثمان نے تیس ہزار کی اسلامی فوج کے ایک تہائی حصہ کا خرچ تنہا اٹھایا تھا۔ دوسرے مہاجروں کے علاوہ مدنی اور انصاری مسلمانوں نے بھی اس موقع پر دل کھول کر حصہ لیا تھا۔

اس کے علاوہ حضرت کلثوم بن الہدم، حضرت حارثہ بن نعمان، حضرت سعد بن معاذ، حضرت سعد بن عبادہ خزرجی، حضرت مخزق وغیرہ باغات و جائیدادیں اور نقد مال اسلامی حکومت کی زندگی بھر دیتے رہے تھے۔ یہی اصل ذریعہ آمدنی تھا۔ باقی سب ہنگامی اور وقتی تھے اور جو مستقل تھے وہ کافی دیر سے حاصل ہوئے تھے۔

مال غنیمت:

عطیات کے بعد مال غنیمت پہلا ہنگامی ذریعہ آمدنی تھا۔ اس کے چار حصے اس مہم کے شریک مسلم فوجیوں میں تقسیم ہو جاتے اور اس کا صرف پانچواں حصہ (خمس) اسلامی ریاست کو ملتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تین مصارف میں خرچ کرتے تھے۔ ایک حصہ اپنے اہل و عیال پر دوسرا خاندان بنو ہاشم پر اور تیسرا مسلمانوں کے دوسرے غریبوں پر، آپ کا اپنا حصہ بھی اکثر و بیشتر غریب مسلمانوں پر ہی خرچ ہوتا تھا کہ آپ اور آپ کی ازواج مطہرات سخاوت و فیاضی کا پیکر تھی۔

ایک تخمینہ کے مطابق دس سال کی مہم جوئی کے نتیجہ میں صرف باسٹھ لاکھ درہم کی مالیت مسلمانوں کو ملی تھی۔ جب کہ کل سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچتی ہے۔ گویا فی کس طرف باسٹھ درہم دس سال میں ملے تھے۔ یعنی ہر سال سوا چھ درہم کے قریب اگر اس رقم سے اخراجات نکال دیئے جائیں تو مال غنیمت خسارے کا سودا تھا۔ مجموعی طور سے مسلمانوں کی کل آمدنی کا صرف دو فیصد حصہ مال غنیمت سے آیا تھا اور ۹۸ فیصد ان کی تجارت زراعت، صنعت و حرفت اور مزدوری سے مال غنیمت میں سے خاص کر جائیداد نے اسلامی ریاست کو کچھ استحکام دیا تھا۔

خراج:

مدینہ منورہ میں یہودی آراضی یعنی بنو قینقاع، بنو النضیر اور بنو قریظہ کی مفتوحہ بستیاں اسلامی ریاست کی ملکیت میں پوری طرح سے آگئی تھیں۔ اس لیے ان کی پیداوار سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ پوری کی پوری اسلامی ریاست کی تھی۔ ۶۲۹ء میں خیبر، فدک، وادی القری اور حماء کی فتح کے بعد ان کی زمینوں کی پیداوار کا نصف پچاس فیصد۔ اسلامی ریاست اور مسلم فوجیوں کو مشترکہ طور پر ملتا تھا جس کا خمس (پانچواں) اسلامی ریاست کا حصہ ہوتا تھا۔ دوسری بستیوں کی پیداوار کا تخمینہ نہیں ملا ہے۔ صرف خیبر کی کل پیداوار چالیس ہزار دوق کھجور، پندرہ ہزار صاع جو اور پانچ ہزار صاع نویں پر مشتمل تھی اور اس کا آدھا مسلمانوں کو ملتا تھا، اور مسلمانوں کے حصہ کا پانچواں حصہ اسلامی ریاست کو اصطلاح میں اسی کو خراج کہتے ہیں۔

جزیہ:

اسی زمانے کے لگ بھگ بعض غیر مسلم قبیلوں جیسے دومتہ الجندل کے قبیلہ بنو کلب کے ایک حصہ نے اسلامی ریاست کو جزیہ شروع کیا جس کی مقدار تین سو درہم سالانہ کے قریب تھی۔ بعد میں دوسرے غیر مسلم قبائل اور گاؤں نے بھی جزیہ دینا شروع کیا ان میں شمال کی عیسائی بستیاں ایلہ، دومہ وغیرہ اور یہودی گاؤں مقنا، جرباء، اذرح وغیرہ شامل تھے۔

جنوبی عرب کی بستیوں میں بخران کے عیسائی دو ہزار حطی (لبادے) سالانہ دیتے تھے جن میں سے ہر ایک کی قیمت ایک اوقیہ (چالیس درہم) ہوتی تھی۔ یعنی کل اسی ہزار درہم

سالانہ یمن کے دوسرے غیر مسلم بھی سالانہ ایک دینار معافری (چالیس درہم) دیتے تھے۔
بحرین عمان وغیرہ کے مجوسی اور عیسائی اور بنو تغلب (یمامہ) کے عیسائی بھی جزیہ دیتے تھے۔ عہد نبوی میں جزیہ کی مقدار ہر علاقہ اور قبیلہ کیلئے ان سے معاہدے کے مطابق طے کی گئی تھی مگر عام شروع ایک دینار سالانہ (بارہ درہم) تھی۔

غیر مسلم لوگوں سے جزیہ اس لیے لیا جاتا تھا کہ اسلامی حکومت ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی ضمانت لیتی تھی۔ ان کو ہر طرح کی مذہبی، سماجی اور تہذیبی آزادی دیتی تھی۔ ان کو جنگ سے مستثنیٰ رکھتی تھی۔ ان کی وقت ضرورت مدد کرتی تھی۔ اگر وہ ان کی حفاظت نہ کر سکے تو جزیہ نہیں لیتی تھی یا واپس کر دیتی تھی۔ اسی لیے ان کو اہل ذمہ یا ذمی کہا جاتا تھا یعنی وہ لوگ جن کا ذمہ اسلامی حکومت نے لے لیا ہے۔

زکوٰۃ و صدقات:

مسلمانوں سے عام نفلی صدقات کے علاوہ بعض مالی حقوق وصول کیے جاتے تھے۔ یہ موجودہ قس کے ٹیکس یا محصول نہ تھے بلکہ وہ ان کے مذہبی فرائض تھے جو اللہ تعالیٰ نے نماز کی طرح فرض کیے تھے۔ ان کا عام نام تو صدقات ہے مگر اصطلاحی نام زکوٰۃ ہے۔

یہ کئی قسم کی ہوتی تھی۔ ۱۔ ایک نقد مال اور سونے چاندی پر لگتی تھی۔ ہر عاقل و بالغ مسلمان کو صاحب نصاب ہونے پر سال بھر کی بچت پر ڈھائی فیصد یا ۱/۴ زکوٰۃ زکوٰۃ میں دینا ہوتا تھا۔ سونے کی کم سے کم ساڑھے سات تولے کی مالیت نصاب بنتی تھی اور چاندی میں باون تولہ۔ ان پر سال گزر جائے تو زکوٰۃ دینی پڑتی تھی۔ نقد رقم میں سونے یا چاندی کے نصاب کے برابر مالیت پر زکوٰۃ لی جاتی تھی۔

چونکہ عربوں کی ایک دولت جانوروں پر مشتمل ہوتی تھی اس لیے ان پر بھی زکوٰۃ مقرر کی گئی تھی۔ شرط یہی تھی کہ سال گزر جائے اور ان کا نصاب پورا ہو۔ اونٹ کا کم سے کم نصاب پانچ تھا۔ ہر پانچ اونٹ پر ایک بکری یا اس کی قیمت دینی ہوتی تھی۔ جب اونٹوں کی تعداد پچیس ہو جاتی تو ایک ششماہ اونٹ یا اونٹنی لی جاتی تھی۔ یہی حساب آخر تک چلتا تھا۔ گائے بیل وغیرہ

جانوروں پر ہر تیس پر ایک راس لی جاتی تھی۔ جب کہ بکری اور بھیڑ میں چالیس کا نصاب تھا اور ہر چالیس پر ایک بکری یا بھیڑ یا اس کی قیمت۔ پھر ہر سیکڑے پر ایک بکری۔ عہد نبوی میں دوسرے جانوروں جیسے گھوڑوں وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی، یہ بعد میں اسلامی حکومت نے لینی شروع کی۔

العشر اور نصف العشر :

جس طرح غیر مسلموں سے ان کی زمینوں کی پیداوار پر خراج لیا جاتا تھا۔ اس طرح مسلم زمین داروں اور کاشتکاروں سے ان کی زمینی پیداوار پر زکوٰۃ لی جاتی تھی۔ اس کی شرح زمین کی قسم اور سینچائی کی محنت کے حساب سے ہوتی تھی۔

اگر وہ اپنی زمینوں کی سینچائی قدرتی..... بارش، دریا، چشمے، نہر وغیرہ..... سے کرتے تھے تو پیداوار کا دسواں حصہ دینا پڑتا تھا جو العشر کہلاتا تھا بشرطیکہ پیداوار پانچ وسق ہو (ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا تھا اور ہر صاع ہندوستانی سیر کے حساب سے ساڑھے تین سیر کا)۔ اگر سینچائی کے لیے کاشت کار کو محنت کرنی پڑتی تھی، وہ کنواں کھودتا تھا، یا ڈولوں کے ذریعہ دور سے پانی لاتا تھا تو اسے پیداوار کا بیسواں حصہ اسلامی ریاست کو دینا پڑتا تھا اور یہ نصف العشر کہلاتا تھا۔

مال تجارت پر زکوٰۃ :

تجارت پیشہ زمینوں سے ان کے مال تجارت پر دس فیصد لیا جاتا تھا اور مسلمانوں سے زکوٰۃ کے مطابق شرح عائد ہوتی تھی۔ حضرموت کے بعض اقبال (شہزادے) اپنی دس فیصد پیداوار زکوٰۃ میں دیتے تھے۔ بعض اور قبیلوں سے بھی دس فیصد وصول کیا جاتا تھا۔

افسران صدقات :

دوسرے انتظامی افسروں اور عہدیداروں کی مانند اسلامی حکومت نے مالی نظام کے افسر بھی مقرر کیے تھے جو عمال یا عمال الصدقات کہلاتے تھے (عمال جمع ہے عامل کی)۔

خصوصی افسران:

مال غنیمت کے عام افسروں کے علاوہ اس کے خمس کے افسر الگ ہوتے تھے۔ اس کے مستقل افسر حضرت حمیہ بن جزیہ زبیدی تھے۔ خیر وغیرہ کے خراج کے مستقل افسر حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی تھے۔ ان کے بعد عہد نبوی میں تین اور افسر مقرر ہوئے۔ بعد میں یہ ذمہ داری علاقہ کے والی یا گورنر کو دے دی گئی تھی۔ وہ مقامی سرداروں کی مدد سے اپنے علاقائی افسروں کے ذریعہ صدقات و خراج اور جزیہ وصول کر کے مرکزی حکومت کے مقرر کردہ مرکزی عاملین صدقات کے حوالے کر دیتے تھے۔

اس طرح صدقات کے افسروں کے تین درجے ہوتے تھے۔ ۱۔ مقامی سردار ۲۔ ان کے اوپر علاقائی گورنر کے مقرر کردہ صدقات کے عمال اور ۳۔ ان کے اوپر مرکزی عاملین صدقات۔ ان افسروں کو صدقات کا ایک حصہ یا مقررہ رقم بطور تنخواہ یا معاوضہ ملتی تھی۔ عہد نبوی میں ایسے مرکزی عمال صدقات کے کم از کم تین نام ملتے ہیں۔

حمی یا چراگا ہوں کا نظام:

صدقات میں جو جانور اسلامی ریاست کو ملتے تھے ان کو اسلامی حکومت کی مخصوص چراگا ہوں میں رکھا جاتا تھا۔ یہ چراگا ہیں ”حمی“ کہلاتی تھیں اور مدینہ منورہ کے علاوہ مختلف جگہوں پر تھیں۔ ان چراگا ہوں کے نگراں افسر ہوتے تھے۔ جو معاوضہ پاتے تھے۔ بعض فی سبیل اللہ کرتے تھے۔

قطیعہ نظام:

اسلامی مالی نظام کا ایک حصہ قطیعہ کہلاتا تھا۔ وہ زمین باغ، یا آراضی کا ایک حصہ ہوتا تھا جس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مستقل طور سے کسی صحابی یا قبیلہ کو عطا کر دیتے تھے۔ وہ اس علاقہ یا قطیعہ پر مالکانہ حقوق رکھتا تھا۔ وہ اسے بیچ سکتا تھا، وراثت میں دے سکتا اور منتقل کر سکتا تھا۔ اس کی آمدنی پر زکوٰۃ لگتی تھی۔ مفاد عام کی چیزیں جیسے نمک، پانی گھاس وغیرہ ہر مسلمان کیلئے ہوتی تھی۔ یعنی وہ صاحب قطیعہ کی ملکیت سے خارج اور مفاد عام کیلئے وقف ہوتی تھیں۔

مذہبی نظام

بعثت نبوی کا اصل مقصد:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصل مقصد دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت تھی اور اسلامی ریاست و حکومت کا اصل مقصد دین کی اشاعت اور شریعت کا نفاذ تھا۔ اسی میں تمام مسلمانوں کی بالخصوص اور تمام انسانوں کی بالعموم دنیا و آخرت کی فلاح و سعادت پوشیدہ تھی۔ دنیاوی بہتری یوں کہ صرف اسلامی نظام ہی انسانی سماج کو ظلم و استحصال سے بچاتا اور عدل و انصاف اور مساوات و فلاح سے نوازتا ہے۔ اخروی سعادت یوں کہ اسی کے نتیجہ میں انسان کو اللہ کے غضب سے نجات، جہنم سے چھٹکارا اور اس کی خوشنودی کے نتیجہ میں جنت کی ابدی کامیابی ملتی ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کام، اسلامی ریاست کا ہر شعبہ اور اس کے ہر شعبہ کا ہر فرد اسلام و دین کی نشر و اشاعت اور شریعت کے نفاذ کیلئے وقف تھا۔ اسلامی معاشرہ، اسلامی ریاست کا انتظامیہ، اس کا فوجی و سیاسی نظام، اس کا معاشی اور مالی نظم و نسق، غرض کہ ہر محکمہ اور ہر شعبہ اور اس کے کارکن اپنی اپنی جگہ اسلام کا کام کر رہے تھے۔ اس اعتبار سے وہ بھی اس کے مذہبی نظام کا جزو تھے۔ تاہم خالص دینی اہمیت کا ایک نظام بھی آپ نے قائم کیا تا کہ اصل کام اوجھل نہ ہونے پائے۔

نظام تبلیغ و تعلیم:

ان میں سب سے اہم اسلام کے مبلغین و معلمین کا تقرر تھا۔ ہر مقامی علاقہ، صوبہ اور شہر کے گورنروں، سرداروں، مالی افسروں، عاملوں اور دوسرے تمام ریاستی کارکنوں کے فرائض میں تبلیغ

تعلیم کا فرض شامل تو تھا ہی آپؐ نے خالص مبلغوں اور معلموں کو صرف اسی کام سے مقرر کیا۔ سب سے پہلے تو آپؐ خود تبلیغ و تعلیم کا کام کرتے تھے اور آپؐ کے صحابہ بھی ہر علاقہ میں جہاں ہوتے یہ کام انجام دیتے۔ چنانچہ تمام غزوات و سرایا، اور سفروں میں تبلیغ و تعلیم کا عام انتظام کیا گیا۔

مبلغین:

خاص مدینہ منورہ میں مسجد نبوی اور صفہ میں آپؐ تعلیم و تبلیغ کرتے، حضرت ابو بکر و عمر، ابو عبیدہ، عبادہ بن صامت اور دوسرے صحابہ یہ کام انجام دیتے۔ آپؐ نے مختلف علاقوں میں خاص طور سے مبلغین بھیجے جو تبلیغ کے بعد تعلیم بھی دیتے تھے۔ ان میں حضرت خالد بن ولید مخزومی (نجران / بنو کعب) حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی (بنو ہمدان) حضرت خالد بن سعید اموی (صنعا) حضرت جریر بن عبداللہ بکلی (حمیر) حضرت عمرو بن العاص سہمی (عمان) اور بہت سے دوسرے مبلغین مختلف علاقوں میں بھیجے گئے۔

بہت سے مبلغوں نے اس راہ میں جان تک دے دی جیسے رجب اور بر معونہ کے شہداء جو اصل میں تبلیغ و تعلیم کے لئے بھیجے گئے۔ اسلامی ریاست کے پڑوسی ملکوں کے بادشاہوں جیسے ایران کے کسری، روم کے قیصر، مصر کے مقوقس، بصری کے والی، حبشہ کے بنحاشی وغیرہ کے پاس بھی بطور خاص مبلغین دفرا میں بھیجے گئے۔ ان مبلغین کے نام تھے: حضرات وجیہ کلبی، عبداللہ حذافہ سہمی، عمرو بن امیہ ضمیری، سلیط بن عمرو، شجاع بن وہب اور حارث بن عمیر وغیرہ۔ ان کے علاوہ عرب کے متعدد حکمرانوں کے پاس بھی بھیجے گئے۔

معلمین:

اسلام کی تعلیم دینے والے بھی مقرر کئے گئے۔ اصل معلم تو آپؐ اور آپؐ کے تمام صحابہ تھے خواہ ان کو مقرر کیا جاتا یا نہ کیا جاتا ہے۔ مگر آپؐ نے خاص طور سے بہت سے معلمین کا تقرر کیا۔

مدینہ منورہ میں اکابر صحابہ کے علاوہ حضرت معاذ بن جبل خزری، حضرت مصعب بن عمیر

عبدری، حضرت اسعد بن زرارہ خزرجی، حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ عبد شمس اور حضرت ابی بن کعب خزرجی وغیرہ معلمین خاص تھے۔

بدوی قبیلوں اور دوسرے علاقوں کے مسلمان مدینہ آتے اور آپؐ سے اور آپؐ کے صحابہ سے اسلام کی تعلیم حاصل کر کے جاتے اور اپنے علاقوں میں معلمین کا کام کرتے بعض علاقوں میں آپؐ نے خاص طوبہ سے معلم مقرر کیے جیسے مکہ مکرمہ کی فتح کے بعد حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کو مکہ والوں کا معلم بنایا پھر طائف کے لئے موخر الذکر کو بھیجا۔ ایسے ہی اور بہت سے معلم مقرر کیے۔

ان مبلغین میں قرآن مجید پڑھانے والے (قراء / مقری) دینی مسائل سے آگاہ کرنے والے (مفتی) اور فیصلے کرنے والے (قاضی) بھی شامل تھے۔ صحابہ کرام میں ایک خاص طبقہ اصحاب صفہ کہلاتا تھا کیوں کہ وہ مسجد نبوی کے شمال میں بنے ہوئے ایک چبوترہ (صفہ) پر رہتے تھے اور مستقل طور سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ ہمہ وقتی طلبائے علم تھے اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بطور معلم کام کرتے تھے۔ وہ سب مدینہ شہر کے باشندوں کے علاوہ باہر کے علاقوں کے مسلمانوں کو بھی تعلیم دیا کرتا تھا۔ بر معونہ اور جمع کے علاوہ باہر کے علاقوں کے مسلمانوں کو بھی تعلیم دیا کرتے تھے۔ بر معونہ اور جمع کے تمام شہداء اصحاب صفہ میں سے تھے۔ اسلامی معلموں اور مبلغوں کا یہ سب سے بڑا طبقہ تھا۔

امامانِ نماز:

دوسرے مذہبی افسروں میں نماز کے امام اور موذن اہم درجہ رکھتے ہیں۔ مسجد نبوی کے اصل امام تو آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم خود تھے مگر آپؐ اپنی عدم موجودگی میں مدینہ منورہ کیلئے خاص امام نماز مقرر فرماتے جو اسلامی ریاست کا سربراہ بھی ہوتا تھا۔

مدینہ منورہ میں آپؐ کی مسجد کے علاوہ اور بہت سی محلہ وار مسجدیں تھیں۔ ان کے امام آپؐ ہی نے مقرر کیے تھے۔ جیسے حضرت معاذ بن جبل، حضرت عتبہ بن مالک، حضرت عبداللہ عمیر خطمی اور حضرت اسید بن حضیر وغیرہ اپنے اپنے قبیلوں اور محلوں کے امام تھے۔ اسی طرح مکہ

مکرمہ، طائف اور دوسرے تمام شہروں اور گاؤں کی مسجدوں کے امام مقرر کیے گئے تھے۔ عام طور سے ان علاقوں کے گورنر اور مقامی سردار اپنے اپنے علاقوں کے امام ہوتے تھے جیسے سرایا کے امیر اپنے لشکروں کے امام ہوتے تھے۔

موذنین:

حضرت بلال بن رباح حبشی اسلام کے پہلے موذن تھے جن کو مدینہ منورہ کی مسجد نبوی کے لئے آپؐ نے مقرر کیا تھا۔ وہ تازندگی اس کے موذن رہے۔ ان کے علاوہ مسجد نبوی میں خاص اوقات اور مواقع پر حضرت عمرو بن مکتوم عامری اور حضرت عثمان بن عفان اموی نے بھی بالترتیب رمضان اور جمعہ کے دن یہ خدمت انجام دیں تھی۔

قباء کی مسجد کے موذن حضرت سعد بن عائد القرظ مقرر کیے گئے تھے جیسے مسجد حرام یا خانہ کعبہ کے موذن حضرت ابو محذورہ نجفی بنائے گئے تھے۔ عام طور سے ہر قبیلہ اور علاقہ والے اپنے موذن مقرر کرتے تھے لیکن بعض کے آپؐ نے بھی مقرر فرمائے تھے جیسے قبیلہ کنده کے لئے موذن اس کے ایک فرد حضرت سفیان بن قیس کندي کو بنایا تھا۔ امام و موذن دونوں عہد نبوی میں فی سبیل اللہ خدمت انجام دیتے تھے۔

مناصب کعبہ و حج:

کعبہ کے تمام پرانے مناصب اسلام لانے کے بعد ختم ہو گئے کہ ساری ذمہ داری اسلامی ریاست نے لے لی تھی لیکن بعض عہدے باقی رکھے گئے تھے۔ ان میں سے سقایہ حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی کے پاس اور حجابہ یا تولیت حضرت عثمان بن طلحہ عبدری کے پاس پہلے کی طرح باقی رکھا گیا تھا۔

کعبہ کے ارد گرد حرم کے علاقے کی حد بندی جب آپؐ نے کرائی تو اس کیلئے خاص افسر مقرر کیے جو اس کے معاملات کے ماہر تھے۔ عہد نبوی میں حضرت تمیم بن اسید خزاعی حرم مقدس کی حد بندی کے افسر تھے۔

امیر حج:

حج اسلام کا چوتھا بڑا رکن ہے اور وہ اسلامی ریاست کے سربراہ یا اس کے نائب کی سربراہی میں انجام دیا جاسکتا ہے۔ فتح مکہ کے بعد آپؐ چوں کہ دو سال حج کیلئے نہیں جاسکے اس لیے ۸ھ میں مکہ کے گورنر حضرت عتاب بن اسید اموی کو امیر حج مقرر کیا۔ دوسرے سال حضرت ابوبکر صدیق کو مدینہ منورہ سے امیر حج بنا کر بھیجا۔

بعض دوسرے مذہبی اور حج کے امور کے لیے بھی آپؐ نے افسر بنا کر بھیجے جیسے حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو سورۃ براءت کا اعلان کرنے کیلئے حضرت ابوبکر کے ساتھ بھیجا یا حضرت ناجیہ بن جندب اسلمی کے ہاتھوں ہدی (قربانی کے جانور) بھیجے۔ ایسے ہی بعض اور مذہبی افسر مقرر کئے تھے۔ ۱۰ھ ۶۳۲ء میں آپؐ نے جو آخری حج کیا اس کے امیر حج آپؐ خود تھے۔ یہ حجتہ الوداع یا حجتہ الاسلام کے نام سے مشہور ہے۔

اسلامی معاشرہ اور سماجی اصلاحات

اسلامی معاشرہ کی بنیادیں:

اسلام نے جو معاشرہ اور سماج پہلے مدینہ منورہ میں اور پھر پورے عرب میں قائم کیا وہ اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کی بنیادوں پر قائم کیا تھا۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیت اس کی بنیاد تھی اور دوسری طرف تمام مسلمانوں کی مساوات و برابری اور تیسری طرف تمام انسانوں کی فلاح و بہبود۔

اسلامی سماج بنیادی طور پر عربوں کے قبائلی نظام پر صرف شکل و صورت کی حد تک قائم رہا۔ قرآن مجید کے حکم کے مطابق قبیلہ، گروہ، خاندان اور علاقہ وغیرہ صرف تعارف و شناخت کے نشان تھے۔ ورنہ عام تقسیم کے لحاظ سے دو قسمیں تھیں۔ مسلم اور غیر مسلم۔ عہد نبوی میں علاقائی اور قبائلی تعصبات کو ختم کر دیا گیا۔ اسی بنا پر تمام مسلمان بھائی بھائی تھے خواہ وہ کسی گروہ، قبیلہ یا علاقہ کے ہوں۔ صرف وہ امتیازات باقی رہ گئے تھے جو شناخت کے لئے ضروری اور اسلامی روح کے مطابق تھے۔

البتہ کبھی کبھی قبائلی عصبیت یا گروہی تعصب بھڑک اٹھتا تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حسن تدبیر سے دبا دیتے یا ختم کر دیتے تھے۔ یہ وہ صالح معاشرہ تھا جس میں نیکی بدی پر، اچھائی برائی پر اور خیر شر پر غالب ہو گیا تھا۔ وہاں گناہ اور جرم ہوتے تھے مگر کبھی کبھی کہ وہ سب انسان بھی تھے اور انسان غلطی اور گناہ کا پتلا ہے۔ مگر اسلام نے یہ معاشرتی اصلاح کی تھی کہ

گناہگار اور مجرم خود شرمندہ ہوتے۔ توبہ کرتے اور خوشی سے اپنی سزا اپناتے تھے تاکہ پاک و صاف ہو جائیں۔

اسلامی سماج کے طبقات

مہاجرین و انصار:

مدینہ میں اسلامی سماج دو بڑے طبقات پر مشتمل تھا: مہاجرین اور انصار: مہاجرین میں زیادہ تر لوگ قریش کے خاندانوں کے افراد یا ان کے طبقات تھے اور کچھ قریشی اور دور کے قبیلوں کے لوگ بھی تھے۔ لیکن وہ سب ایک طبقہ مہاجرین میں شمار کیے جاتے تھے۔ صلح حدیبیہ تک ان کی تعداد اچھی خاصی ہونے کے باوجود زیادہ نہ تھی لیکن اس کے بعد ان کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی اور آٹھ دس ہزار تک جا پہنچی۔ انصار میں قبیلہ خزرج کی تعداد زیادہ تھی اور قبیلہ اوس کی ان سے کم۔ یہ دونوں مل کر انصار کہلاتے تھے۔ مدینہ کی آبادی تیس ہزار سے زائد تھی۔

بدوی قبائل:

مدینہ منورہ کے اصل طبقات کے علاوہ قرب و جوار کے قبیلہ کے لوگ بھی وہاں آکر بس گئے تھے۔ ان میں اسلم، غفار، مدج، ضمرہ، مزینہ، ارجمینہ اور شمال و جنوب کے بعض اور قبیلوں کے لوگ بھی تھے جیسے ازد، شنورہ وغیرہ مگر ان کی تعداد کافی کم تھی۔

مراتب:

بحیثیت مسلم ان میں سے ہر فرد طبقہ کو یکساں حقوق حاصل تھے لیکن اسلام کی خدمات اور اسلام قبول کرنے کے لحاظ سے ان کے دینی مرتبہ اور سماجی مقام میں فرق تھا۔ پہلے اسلام لانے والے مہاجرین کو سابقین اولین کہا جاتا تھا اور وہ سب سے افضل تھے۔

ہجرت نبوی کے بعد غزوہ بدر تک مہاجر و انصار مسلمانوں کا مقام ان کے بعد تھا۔ پھر سب سے افضل بدری صحابہ تھے۔ جنہوں نے جنگ بدر میں حصہ لیا تھا۔ ان کے بعد وہ صحابہ کرام تھے جو صلح حدیبیہ یا فتح مکہ تک اسلام لائے تھے اور فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والے آخری درجہ میں تھے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو بچوں پر فوقیت حاصل تھی۔ عورتوں کو مردوں کی مانند یکساں مقام

و مرتبہ حاصل تھا بلکہ ازواج مطہرات کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خاص مقام و مرتبہ دیا جاتا تھا کہ وہ مسلمانوں کی مائیں تھیں اور ان کے برابر کوئی نہ تھا (سورۃ احزاب ۶ اور ۵۳)

دوسرے شہروں، قصبوں، گاؤں اور صحراؤں کے مسلمانوں کو ان کے زمانہ قبول اسلام کے لئے ان کی خدمات اور علوم و فنون میں امتیاز کے مطابق سماجی دینی مقام دیا جاتا تھا۔

منافقین

مدینہ منورہ میں ہجرت نبوی کی کچھ مدت بعد ہی منافقین کا طبقہ بھی وجود میں آیا جو دل سے کافر اور بظاہر مسلمان تھے۔ ان کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول خزرجی تھا۔ آپ کے آنے سے قبل وہ مدینہ کا بادشاہ بننے والا تھا مگر اس کی تمنا پوری نہ ہوئی، لہذا وہ اور اس کے کچھ ساتھی نفرت حسد اور دنیاوی فائدوں کیلئے اسلام کے مخالف بن گئے اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ بالآخر ۹ھ ۶۳۱ء میں غزوہ تبوک کے بعد ان کی طاقت بالکل ختم ہو گئی۔

غیر مسلم طبقات:

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے علاوہ کچھ غیر مسلم طبقات تھے۔ جن میں سب سے بڑی تعداد یہود کی تھی۔ عیسائی وغیرہ بہت کم بلکہ چند افراد ہی تھے۔ یہودیوں کے تقریباً درجن قبیلے تھے جن میں سے تین..... بنو قینقاع، بنو النضیر اور بنو قریظہ..... اسلام کی مخالفت اور اسلامی ریاست سے غداری کرنے کے سبب زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کی تعداد بھی کئی ہزار تھی اور دولت و طاقت کے حساب سے بھی وہ ممتاز تھے۔ عیسائی اور پارسی وغیرہ دو چار تھے اور زیادہ تر غلام و مزدور۔ جب کہ یہودی تاجر، زراعت پیشہ اور حرفت والے تھے۔ وہ سب کے سب اسلامی ریاست کے ذمی یا اہل الذمہ تھے۔

اقتصادی طبقات:

پیشہ کے اعتبار سے مسلم آبادی چار طبقوں میں بٹی ہوئی تھی:

۱۔ تاجر..... مہاجرین میں اکثر مقامی اور بین الاقوامی تجارت میں شریک تاجر تھے۔ اور شام و یمن وغیرہ متعدد علاقوں اور ملکوں سے تجارت کرتے تھے۔ مہاجرین میں سے مالدار لوگوں

نے زرعی جائداد دیں بھی بنالی تھیں۔ خاص کر خیبر کی فتح کے بعد بہت سے لوگوں کے پاس کھیت، باغات اور مکانات ہو گئے تھے۔

۲..... انصار میں سے زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ تھے اور مدینہ میں اور اس کے ارد گرد ان کے کجھوروں اور پھلوں کے باغات اور اناج میں جو، گیہوں اور سبزی وغیرہ کے کھیت تھے۔ ان میں کافی لوگ تجارت بھی کرتے تھے لیکن وہ زیادہ تر مقامی تجارت میں مصروف رہتے تھے۔

۳..... مسلمانوں کے دونوں طبقات کی اکثریت اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھی۔ وہ یا تو چھوٹے چھوٹے دستکار یا حرفہ والے تھے جیسے لوہار، بڑھئی سنار چمڑے کا کام کرنے والے وغیرہ۔

۴..... یا مزدور تھے اور کھیتوں اور باغوں میں اجرت پر کام کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ خوشحال اور مالدار طبقات کے گھروں میں خانگی نوکروں کا کام کرتے تھے یا چرواہے وغیرہ تھے۔

عجمی طبقات:

عہد نبوی میں مسلمانوں کی غالب اکثریت عربوں پر مشتمل تھی۔ لیکن کچھ عرب اور عجمی موالی بھی رہتے تھے۔ یعنی وہ عجمی لوگ یا عرب قبیلوں کے افراد جو اپنے علاقوں اور خاندانوں کو غلامی وغیرہ کے اسباب کی بنا پر چھوڑ کر مدینہ یا دوسرے علاقوں میں بس گئے تھے۔ عجمی موالی میں حضرت بلال حبشی اور حضرت سلمان فارسی بہت اہم افراد تھے۔ اسی طرح بہت سے عرب موالی بھی تھے جیسے حضرت زید بن حارثہ کلبی وغیرہ۔ موالی ہونے کے باوجود ان کو اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست میں یکساں سماجی، دینی، معاشی اور سیاسی حقوق حاصل تھے۔ چوں کہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لیے ان کو عہدے اور مناصب نسبتاً کم ملے مگر ان میں سے جو صاحب لیاقت تھے ان کو عہدے بھی خوب ملے۔

اسلامی معاشرہ:

عہد نبوی کا اسلامی معاشرہ اسلامی اخوت و مساوات کے اصولوں اور عدل و انصاف کی بنیادوں پر قائم تھا۔ اس میں لیاقت و صلاحیت اور تقویٰ کی بنیاد پر امتیاز ملتا تھا۔ بحیثیت

مجموعی وہ بہترین انسانی معاشرہ تھا جس میں شر پر خیر پوری طرح غالب تھا۔ یہ آدرش معاشرہ تھا۔ ایسا معاشرہ پھر کبھی وجود میں نہیں آیا اور نہ آسکتا ہے کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تربیت یافتہ اصحاب کرام کا معاشرہ تھا۔ نہ اب نبی ہوں گے نہ ان کے اصحاب جیسا معاشرہ ہوگا۔

اسلامی معاشرہ کی خصوصیات یہ تھیں:-

- ۱۔ وہ قرآن و حدیث کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔
- ۲۔ انسانی جذبات و خیالات اللہ و رسول کے احکام کے تابع تھے۔
- ۳۔ ان میں اتحاد، یگانگت، خیر سگالی، محبت اور ایثار بے پناہ تھا۔
- ۴۔ وہ اسلام اور اسلامی ریاست کے لئے سب کچھ ترجیح دیتے تھے۔
- ۵۔ تقویٰ اور خشیت الہی کے سبب شرم تھا۔
- ۶۔ اگر ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا تو فوراً اس کی اصلاح کر لیتے۔
- ۷۔ وہ مجموعی خیر پر مبنی معاشرہ تھا۔

سماجی اصلاحات

سماجی تحفظ کا نظام:

اسلامی نظام معاشرت نے تمام انسانوں کی جان و مال اور آبرو کے تحفظ کا نظام قبائلی روایات اور اسلامی قوانین کی بنیاد پر قائم کیا۔ پہلے کسی کی جان محفوظ تھی نہ مال اور نہ آبرو۔ قصاص اور دیت کے اصولوں کے ذریعہ افراد کو بھی اور پورے طبقات کو بھی یہ تحفظ فراہم کیا گیا۔ قتل کی سزا قتل یا خون بہا کے طور پر سواونٹ کی رقم مقرر کی گئی اور ہر قبیلہ کو پابند کیا گیا کہ وہ قاتل و مجرم کی حرکتوں کا ذمہ دار ہوگا۔ اور دیت و قصاص کے نفاذ کا بھی ذمہ دار ہوگا۔ وہ مجرم کو پناہ نہ دے گا بلکہ اس کو پکڑ کر سزا دلوائے گا۔

اسی طرح چوری، ڈکیتی وغیرہ دوسرے جرموں کی سزا مقرر کی گئی، بدکاری کی سزا موت یا سو کوڑے طے کی گئی۔ نیک لوگوں پر جھوٹی تہمت لگانے اور دوسروں کی آبروں سے کھیلنے کی سزا

اسی کوڑے تھی۔ شراب نوشی کی سزا بھی چالیس یا اسی کوڑے اور قید و بند مقرر کی گئی۔
قوانین اور سزاؤں سے زیادہ لوگوں کے اخلاق کو سنوارا گیا اور ان میں فسق و فجور اور گناہ
دشمنی سے نفرت اور ایمان و اخلاق سے محبت پیدا کی گئی۔ ان دونوں نے مل کر پورے
معاشرے کو محفوظ و مامون بنا دیا۔

اس کے نتیجے میں قتل، چوری، ڈکیتی، بدکاری، شراب نوشی اور جوابداری جیسے بہت سے جرائم
ختم ہو گئے، جنگوں کا سلسلہ جو انتقام کا چکر تھا ختم ہوا اور امن و امان..... بے مثل امن و امان..... کا
دور دورہ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی پوری ہوئی کہ اکیلی عورت سونا اچھالتی ایک
کوئے سے دوسرے کوئے تک جائے گی اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا خوف نہ ہوگا۔

نکاح و طلاق کی اہمیت:

عربوں میں رواج تھا کہ مرد بہت سی عورتوں سے شادی کر لیتے تھے۔
(POLYGAMY) ان کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اسی طرح عورتیں بھی بیک وقت کئی
کئی مردوں کے نکاح میں رہتی تھی POLYANDRY اگرچہ ایسا کم تھا۔ نکاح میں رشتوں کا
احترام بھی نہیں رکھا جاتا تھا۔ سوتیلی ماں تک سے شادی کر لی جاتی تھی۔ اسلام نے ان سب
خرابیوں کی اصلاح کی۔

نکاح:

سب سے پہلے تو یہ پابندی لگائی کہ مرد صرف ایک سے شادی کرے اور اگر اسے
ضرورت ہے تو عدل کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ ایک وقت میں چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ نکاح
کیلئے مہر کی رقم اور بیوی کا نان نفقہ یعنی کھانا کپڑا اور مکان ضروری حق قرار دیا۔ اسی طرح بیوی
کے ساتھ حسن سلوک بھی ضروری بتایا اور بیویوں پر شوہروں کے حقوق بھی واضح کیے۔

دوسری پابندی یہ لگائی کہ بعض رشتوں کو حرام کر دیا چنانچہ ماں، خالہ، دادی، نانی، بہن
بٹی، بھانجی، بھتیجی، پھوپھی، رضاعی ماں اور ساس اور ان جیسے دوسرے رشتوں اور بہو وغیرہ سے
شادی حرام قرار دی۔ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کی بھی ممانعت کر دی۔ کئی مردوں

سے ایک عورت کا نکاح ایک وقت میں قطعی حرام کر دیا کہ وہ ایک وقت میں صرف ایک مرد کی بیوی بن سکتی ہے۔ اسی طرح کافر و مشرک عورتوں اور مردوں سے شادی حرام قرار دی۔ مسلمان مردوں کو البتہ اجازت دی کہ وہ اہل کتاب عورتوں میں سے نیک و پاکدامن بیبیوں سے نکاح کر سکتے ہیں۔ (سورۃ نساء ۲۲-۲۳، سورۃ نحتہ ۱۰ وغیرہ)

طلاق:

اگر چہ طلاق دینے کا حق اسلام نے مردوں یعنی شوہروں کو دیا ہے تاہم اس کو حلال چیزوں میں سے سب سے ناپسندیدہ بھی قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ صرف اللہ کے حدود قائم نہ رہنے کی صورت میں طلاق کی اجازت دی ہے۔ اور وہ بھی صرف دو طلاقیں کی تاکہ اگر چھتاوا ہو تو رجعت کر کے بیوی کو واپس لے لے۔

تین طلاقیں دینے کو منع کیا ہے لیکن اگر وہ تین طلاقیں دے کر بالکل قطع تعلق کرنا چاہے تو یہ پابندی لگائی کہ ہر طلاق ہر ماہ میں بیوی کی پاکی کے زمانے میں، جب اس سے قربت و مباشرت نہ کی ہو، دے۔ اس طرح تین ماہ میں تین طلاقیں دے اس کے بعد واپسی کا راستہ بند کر دیا۔ صرف حلالہ کی صورت میں واپسی ہو سکتی ہے اور حلالہ پر اللہ کی لعنت ہے۔

نکاح کا مقصد:

نکاح کا مقصد یہ ہے کہ مرد و عورت دونوں پاکی کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اس رشتہ کے بغیر کسی سے تعلق و مباشرت نہ رکھیں کہ انسانی معاشرہ گندگی سے پاک رہے اور انسانی نسل میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہے جس طرح اسلام نے انسان کی بھوک پیاس اور دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کے جائز و پسندیدہ طریقے بتائے ہیں اسی طرح اس کی جنسی خواہش کی صحیح اور پاکیزہ تکمیل کا ذریعہ نکاح کے ذریعہ نکالا ہے۔

حد زنا:

لیکن اگر انسان اسلامی شریعت کی مقرر کردہ حدود کو پھلانگ کر اپنی جنس خواہش پوری

کرنی چاہے تو اس کو بدکاری اور زنا قرار دے کر اس کو گناہ کبیرہ بتایا ہے اور اس کی مرتکب کے لیے سزا مقرر کی ہے۔ اگر غیر شادی شدہ شخص یہ حرکت کرے تو اس پر سوکڑوں کی سزا عائد کی جائے گی۔ اگر شادی شدہ مرد عورت اپنی پسند و ارادہ سے زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو رجم یا سنگسار (پتھر مار مار کر ہلاک) کر دیا جائے کیوں دو شخصوں کی زندگی سے پورا معاشرہ گندا ہو جاتا ہے اور دوسروں کے حقوق تلف ہو جاتے ہیں۔ اگر زنا کار کا جرم چھپ جائے اور وہ نادم ہو کر توبہ کرے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے۔

احساس گناہ:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاشرہ تعمیر کیا تھا اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اکثر لوگ گناہ سے بچتے تھے لیکن اگر ان میں سے کسی سے زنا کا جرم جذبات کے غلبہ سے ہو جاتا تھا تو اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی سزا بھگتتے تھے۔ حضرت ماعز اور ایک صحابیہ حضرت غامدیہ سے یہ جرم سرزد ہوا تو دونوں نے الگ الگ آکر آپ کی مجلس میں اپنے خلاف گواہی دی اور اپنی جان دے کر پاکی حاصل کر لی۔ آپ نے ان کے پاک ہونے کی گواہی دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ انہوں نے ایسی توبہ کی ہے۔ اگر مدینہ والوں پر تقسیم کر دی جائے تو سب کی مغفرت ہو جائے۔

جوا: (قمار بازی)

دوسری سیاسی خرابیوں کی اصلاحات میں جوئے کی ہر قسم کو حرام قرار دیا کہ اس میں ایک فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہے۔ کیوں کہ جوا فریب پر مبنی ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ فریب اور دھوکہ دہی کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔

شراب نوشی:

اسی طرح شراب نوشی حرام قرار دی گئی۔ وہ مدت سے عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی اور یکنخت اس کا چھوڑنا مشکل تھا۔ لہذا پہلے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا۔ لوگ اس پر عمل کرنے لگے تو پھر شراب کی تجارت حرام کی گئی۔ لوگوں نے اس پر بھی عمل کیا اور آخر میں

شراب پینے کے قطعی حرام ہونے کا حکم آیا تو سب مسلمانوں نے ایک دم چھوڑی۔ روایت ہے کہ مدینہ میں اس دن اتنے شراب کے مٹکے توڑے گئے اور اتنی شراب بہائی گئی کہ گلیوں اور سڑکوں پر کچھڑ ہو گئی۔

شراب کے قطعی حرام قرار دینے کے بعد اسلامی شریعت نے قانون بنایا کہ اگر اب کوئی جان کر شراب پئے تو اس کو کوڑوں کی سزا دی جائے۔ عہد نبوی میں اس سزا کی حد نہ تھی۔ اسی یا چالیس کوڑوں اور جوتوں چل سے مرمت کرنے کی روایات آتی ہیں۔ بعد میں اسی کوڑے کی سزا مقرر ہو گئی۔

چوری اور ڈکیتی:

چوری کی سزا زیادہ سے زیادہ ہاتھ کاٹنا مقرر ہوئی۔ کم سے کم تہیہ، قید یا جلا وطنی تھی۔ دراصل سزا مالیت پر منحصر تھی۔ عہد نبوی میں چوری کے صرف اکادکا واقعات ہوئے۔ اسی طرح ڈکیتی کی سزا موت مقرر کی گئی۔ اس کے بھی دو چار واقعات مذکور ہوئے ہیں۔ ورنہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں خاص کر اور دوسروں میں بھی وہ بلند اخلاق پیدا کر دیتے تھے کہ وہ ان گناہوں سے دور رہتے تھے۔

غلامی:

عربوں کے سماجی ڈھانچے میں غلامی کی قبیح لعنت موجود تھی۔ اسلام اس بری چیز کو پسند نہیں کرتا اور نہ اجازت دیتا ہے لیکن وہ اس کو یک لخت ختم بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس سے عربوں کا سماجی، اقتصادی اور فوجی نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس لیے اس نے غلامی کی ایک طرف تو حالت بہتر بنائی، ان کو حقوق دیئے اور ان کے فرائض مقرر کیے۔ دوسری طرف آہستہ آہستہ غلامی کا نظام ختم کرنے کے طریقے بتائے۔

بحیثیت مسلمان غلاموں کو برابر کے دینی حقوق دیئے۔ وہ مذہبی لحاظ سے آزادوں کے برابر تھے، جیسے ان کے فرائض ویسے ان کے حقوق۔ سماجی اور اقتصادی لحاظ سے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کے آقاؤں پر فرض قرار دیا۔ ان کو مالک کی حیثیت کے مطابق کھانے،

کپڑے اور رہنے کی جگہ ضروری بنائی۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی ضروری قرار دی۔ ان کے دکھ سکھ کا خیال فرض بنایا۔ ان کی آزادی کو سب سے بڑے اجر و ثواب کا کام قرار دیا۔

غلاموں کی آزادی کیلئے دینی فرائض میں بھی گنجائش نکالی۔ مثلاً روزہ توڑنے، طہار کا جرم کرنے (بیوی سے الگ رہنے کی قسم توڑنے) قتل کرنے وغیرہ کا کفارہ یہ بتایا کہ مسلمان مجرم اگر صاحب غلام ہو تو غلام آزاد کرے۔ پھر غلاموں کو مکاتبت (رقم ادا کرنے) کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا۔ مالک کی باندی کو جو بیوی کی مانند رہے ام الاقرار دے کر مالک کی موت کے بعد از خود آزاد ہونے کا حق دیا۔

غرضیکہ ان کی آزادی کے اتنے طریقے نکالے اور ان کی آزادی کو اتنا بڑا کام بتایا کہ سب غلام آزاد ہو گئے۔ اور جو غلام رہ گئے ان کی حالت اتنی بہتر کر دی کہ وہ اسلامی حکومت کے افسر بنے، عالم و محدث اور مفسر بنے۔ عہد نبوی کے غلاموں پر تو ہم آزاد رشک کر سکتے ہیں۔

مجبور طبقات کی بہتری:

سماج میں عورتوں خاص کر بیواؤں اور یتیم بچوں کی حالت بہتر بنائی۔ ان کو بہت سارے حقوق دیئے جو اسلام سے پہلے کے نظام نے غصب کر لیے تھے۔ ان کو سماجی عزت دی۔ اقتصادی آزادی دی۔ دینی اور مذہبی مساوات دی اور ضرورت بھر سیاسی اور فوجی حقوق بھی دیئے۔ چوں کہ ان کا دائرہ کار الگ ہے، اس لیے ان کے دائرے میں ان کی عزت قائم کی۔ اسی طرح بیواؤں اور یتیموں کے حقوق مقرر کیے اور ان کا سماجی رتبہ بلند کیا۔

نظام وراثت:

اقتصادی نظام میں دو اہم اصلاحات کیں: اول وراثت کا نظام جاری کیا۔ پہلے مرنے والے کی ساری جائیداد اس کا فرزند یا بھائی یا کوئی دوسرا مرد لے لیتا تھا اور دوسرے حقداروں کو کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ اسلام نے بیٹے کے ساتھ بیٹی، بیوی اور ماں باپ کا حصہ بھی مقرر کیا۔ عورتوں کو ان کے ہم پلہ مردوں کے مقابلے میں آدھا حصہ وراثت میں دیا گیا کہ عورت اپنے باپ کے علاوہ اپنے شوہر کی وراثت میں بھی حصہ پاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس پر کوئی اقتصادی

بوجھ نہیں رکھا بلکہ شادی سے پہلے اس کے ماں باپ بھائی وغیرہ دوسرے والی پر اس کی ذمہ داری عائد کی اور شادی کے بعد اس کے شوہر پر۔ مرد اپنے اور اپنے اہل و عیال کا پورا مالی بوجھ اٹھاتا ہے۔ اس لیے اسے عورت کا دو گنا حصہ میراث میں دیا گیا۔ وراثت کے مقررہ حصے قرآن مجید کی سورہ نساء کی ابتدائی آیات میں بیان کیے گئے ہیں۔

تجارتی اصلاحات:

اقتصادی اصلاحات میں اسلامی نظام تجارت و زراعت کی اصلاحات بھی آتی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی وہ تمام قسمیں حرام قرار دیں جن میں کسی قسم کا دھوکہ یا فریب یا اس کا شائبہ بھی تھا اور جس کے سبب فریقین میں سے کسی ایک کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان ہوتا تھا۔ ان میں سے ہم جنس چیزوں کی کمی بیشی کے ساتھ تجارت بھی شامل تھی مثلاً سونے کے سونے سے، چاندی کی چاندی سے، نقد رقم کی نقد رقم سے، گیہوں کی گیہوں سے یا اسی طرح ایک جنس کی اس جنس میں گھٹا بڑھا کر خرید و فروخت حرام قرار پائی۔ برابر کی تجارت جائز قرار دی۔

سود کی تحریم:

اسی میں سودی کاروبار بھی آتا ہے۔ مکہ، طائف، مدینہ اور خیبر وغیرہ کے تمام مالدار تاجر اور کاشتکار سودی کاروبار کرتے تھے۔ وہ سود پر روپیہ قرض دیتے یا تجارتی سود لیتے تھے۔ ان میں عرب وغیر عرب، مسلمان اور یہودی سبھی ملوث تھے۔ سود کی شرح معمولی بھی تھی اور بھاری بھی۔ وہ سود در سود یا مرکب سود پر مبنی کاروبار کرتے تھے۔ اسلام نے رفتہ رفتہ سود کی تجارت اور سودی کاروبار حرام قرار دیا۔ پہلے مرکب سود یا چند در چند سود لینا حرام قرار پایا، پھر معمولی سود بھی حرام ہوا۔ فتح مکہ کے بعد ہر قسم کا سود ممنوع ہو گیا۔ اور سود لینے کو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا۔ (سورہ بقرہ ۷۸-۷۹، آل عمران ۱۳۰، نساء ۱۶۱ اور سورہ الروم ۳۹)۔

سودی کاروبار چوں کہ سارے انسانوں کا استحصال کرتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے علاوہ اسلامی ریاست کی ذمیوں کو بھی سود لینے دینے سے منع کر دیا۔

چنانچہ بحران کے عیسائیوں وغیرہ سے جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ سودی کاروبار نہ کریں گے۔

صحیح اوزان و ناپ:

تجارتی کاروبار میں ترازو صحیح رکھنے اور صحیح وزن کے بانٹ رکھنے ضروری قرار پائے اور کم ناپ تول کو حرام قرار دیا۔ اسی طرح بہت سے زرعی یعنی کھیتی باڑی کے معاملات ناجائز قرار دیئے جن میں کسی ایک فریق کا نقصان تھا۔ مثلاً پھلوں کے درختوں پر آکر مضبوط ہو جانے سے قبل پیداوار کی خرید و فروخت حرام قرار دی۔ مختلف جنس کی چیزوں کی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ صحیح بتایا تو ہم جنس چیزوں کا حرام۔

کھانے پینے کی اصلاحات:

سماجی اصلاحات کے سلسلہ میں اسلام نے کھانے پینے کی چیزوں (ماکولات و مشروبات) میں بھی حلال و حرام کا اصول نافذ کیا۔ اسلام سے پہلے ایسا کوئی معیار نہ تھا۔ لوگ جو چاہتے کھاتے پیتے تھے۔ اسلامی اصول یہ مقرر کیا کہ پاکیزہ چیزیں (طیبات) حلال اور تمام گندی چیزیں (حیثات) حرام قرار دیں۔ گوشت میں سوروں، مردار جانوروں، درندوں اور پنچہ دار پرندوں، کیڑے مکوڑوں، سانپ بچوؤں وغیرہ کو حرام کیا۔ خون اور تہوں کے چڑھاوے کے جانور بھی حرام بتائے۔ صرف حلال اور ذبیحہ جانوروں کا گوشت ہی جائز بتایا۔ مشروبات میں تمام نشہ آور چیزیں جیسے شراب، بھنگ، اورافیون وغیرہ حرام قرار دیں۔

دراصل خبیث اور گندی چیزوں کا انسان کے اخلاق و کردار پر اثر پڑتا ہے۔ اور ماکولات و مشروبات میں اسلام نے یہ اصول اپنایا کہ پاک چیزیں حلال رکھی جائیں اور گندی چیزیں حرام کر دی جائیں تاکہ انسان میں پاکیزہ صفات پیدا ہوں۔

اسلام اور اسلامی شریعت کی تکمیل

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین اسلام لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں پر رکھی تھی: اول: عقائد..... دوم: ارکان..... سوم: قوانین..... چہارم: اخلاق۔)

الف۔ عقائد

۱۔ توحید:

اسلام کا بنیادی عقیدہ تو توحید ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک اکیلا معبود، مالک و آقا ماننا اور اسی کی عبادت کرنا۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں۔ اس کے علاوہ اور سب خداؤں کا انکار کرنا۔ اسی سے تقدیر کا عقیدہ وابستہ ہے کہ وہی عالم الغیب والشہادہ اور مالک کل ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

۲۔ رسالت:

دوسرے سارے عقیدے اسی بنیادی عقیدے سے وابستہ ہیں یا اس کی لازمی شاخیں ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ رحمن و رحیم ہے اور اپنے بندوں کی دیناوی اور ماڈی ضرورتیں پوری کرتا ہے اس لیے وہ ان کی اخروی اور دینی فلاح و بہبود کا بھی انتظام کرتا ہے۔ اسی سے اسلام کا دوسرا عقیدہ وجود میں آیا یعنی رسالت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت

کیلئے ہر زمانے میں نبی اور رسول بھیجے حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ وسلم تک۔ آپ اس کے آخری رسول ہیں اور آپ پر رسالت ختم ہو گئی۔ لہذا تمام رسولوں پر اور آپ کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان رکھنا دوسرا عقیدہ ہے۔ آپ ختم المرسلین اس لیے ہیں کہ آپ سارے انسانوں کیلئے قیامت تک کیلئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ جب کہ دوسرے محد و وقت اور مخصوص لوگوں کے لئے مبعوث کیے گئے تھے۔

کتابوں اور فرشتوں کا عقیدہ:

رسالت کے عقیدے کے ساتھ اللہ کی تمام کتابوں، صحیفوں اور فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے کہ وہ اس سے وابستہ عقیدے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اپنے رسولوں پر کتابیں نازل کرتا رہا ہے جو اس کا کلام ہوتا ہے۔ اس کا آخری کلام قرآن مجید ہے جو باقی اور محفوظ ہے۔ باقی کتابیں اور صحیفے محرف یا فٹا ہو گئے۔ اس لیے قرآن مجید ہی کو صرف صحیح کلام الہی ماننا ضروری ہے۔

۳۔ آخرت:

چونکہ انسان کی تخلیق اور دینا کی پیدائش انسان کی آزمائش کیلئے کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ یا نافرمانی۔ اس لیے تیسرا لازمی اور بنیادی عقیدہ یہ قرار پایا کہ ایک دن یہ دنیا فٹا ہو جائے گی اور انسان موت کے بعد پھر اٹھایا جائے گا کہ وہ اپنے اعمال کے مطابق جزایا سزا پائے۔ اس سے آخرت و معاد کا عقیدہ پیدا ہوا۔ اسی میں قیامت، حساب کتاب، موت کے بعد زندہ ہونا، اجر و سزا پانا اور جنت و جہنم اور ان سے متعلق عقیدے پیدا ہوئے۔

ان تمام عقیدوں پر سچے دل سے ایمان لانا اور زبان سے ان کا پکا اقرار کرنا مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہے۔

(ب) ارکان اسلام:

اسلامی عقائد کا عملی اظہار اسلامی ارکان میں ہوتا ہے۔ بنیادی ارکان چار ہیں: صلوٰۃ (نماز) صوم (روزہ) زکوٰۃ و صدقہ (خیرات) اور حج (مکہ مکرمہ اور خانہ کعبہ کی زیارت اور بعض

رسوم و عبادات) ہر مسلمان پر یہ چاروں فرض ہیں۔ زکوٰۃ و حج کیلئے صاب مال و استطاعت ہونے کی شرط ہے۔ صلوٰۃ و صوم کیلئے صرف بالغ و متمند ہونے کی۔

اسلام ایک دین فطرت ہے اور اس بنا پر اس نے تمام عقائد و ارکان و عبادات میں تدریجی ارتقاء کا اصول اپنایا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پہلے اللہ کی توحید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار کا مطالبہ کرتا ہے اور پھر دوسرے عقائد کا۔ اس اقرار و یقین کے بعد وہ آہستہ آہستہ ارکان و عبادات کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے اور وہ بھی یکے بعد دیگرے۔

(۱) صلوٰۃ: (نماز)

تمام عبادات میں صلوٰۃ (نماز) سب سے اہم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے۔ اور اس کی ترک کو کفر کی۔ قرآن کریم میں اس کی سب سے زیادہ تاکید آئی ہے۔ پھر عقائد کے بعد یہی سب سے پہلی عبادت ہے جو آپؐ کو سکھائی اور مسلمانوں پر فرض کی گئی۔ سورۃ اقرء کی پہلی آیات کریمہ جس رات نازل ہوئیں اس کی دوسری صبح کو حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور آپؐ کو وضو اور طہارت کا طریقہ سکھایا اور پھر دو رکعت نماز سکھائی۔ بعد میں آپؐ نے حضرت خدیجہ کو طہارت و نماز کی تعلیم دی اور دوسرے مسلمانوں کو بھی آپؐ نے ان کے اسلام لانے کے بعد سب سے پہلے نماز سکھائی۔

نماز کا ارتقاء:

پہلے دن بھر میں صرف دو رکعت نماز دوپہر میں فرض تھی۔ پھر دو رکعت عصر کی فرض ہوئی اور قرآن مجید کے نزول کے کئی برس بعد معراج میں دن رات کی بیخگانہ نمازیں فرض کی گئیں۔ یعنی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء حضرت جبرائیل نے دوبارہ آپؐ کو یہ ساری نمازیں ان کے اوقات میں سکھا کر پوری امت کو ان کے طریقہ وقت اور کیفیت کی تعلیم دی۔

فرض:

بیخگانہ نمازوں میں تین طرح کی رکعات ہیں اول فرض دوم سنت سوم نفل فجر کی دو ظہر اور عصر اور عشاء کی چار چار اور مغرب کی تین رکعتیں فرض ہیں اور کسی حال میں معاف نہیں ہوتیں۔

چھوڑنے والا سخت گنہگار ہوتا ہے پہلے تمام فرض نمازیں دو دو رکعات تھیں پھر مقیم کے لئے چار کر دی گئیں اور مسافر کے لئے دو ہی رکھی گئیں۔ مغرب کی تین ہی فرض رکعتیں ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی نماز میں دو دو رکعت چاشت کے وقت واجب ہیں۔

سنت:

دن بھر میں بارہ رکعات سنتیں ہیں، فرض فجر سے پہلے دو ظہر کے فرض سے پہلے چار اور بعد میں دو، مغرب اور عشاء کے فرضوں کے بعد دو دو۔ ان کے پڑھنے سے جنت میں گھر ملنے کا وعدہ نبوی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہیں مگر پڑھنا چاہئے۔ عشاء کی دو سنتوں کے بعد تین رکعتیں وتر کی ہیں۔ بعض علماء ان کو سنت اور احناف واجب کہتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کبھی نہیں چھوڑا۔

نفل:

باقی نمازیں نفلی ہیں۔ ان کی کوئی تعداد مقرر نہیں۔ ہر فرض کے ساتھ نفل رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر تہجد کی نماز آدھی رات میں (آٹھ یا بارہ رکعات) سب سے افضل ہے۔ چاشت یا اشراق کی نمازیں نفل و مستحب ہیں۔ پڑھے تو ثواب نہ پڑھے تو گناہ نہیں۔ پھر دن رات میں ممنوع اوقات کے علاوہ چاہے جتنی رکعات پڑھے۔

(۲) صیام رمضان:

اسلام کا دوسرا رکن روزہ (صوم) ہے۔ مکہ مکرمہ میں قریش کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عاشوراء (دسویں محرم) کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ وہ غالباً سنت ابراہیمی تھی۔ بعد میں مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کو عاشورائی کا روزہ رکھتے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ سنت موسوی بھی ہے۔ آپؐ نے خود بھی اور مسلمانوں کو بھی رکھنے کا حکم دیا اور یہود سے فرق کرنے کیلئے نویں محرم کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

۲ھ ۶۲۳ء میں غزوہ بدر کے بعد رمضان کے پورے ماہ کے روزے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیے، جس طرح پہلی قوموں پر فرض کیے گئے۔ اسی سال پہلی شوال کو عید الفطر

کی نماز پڑھی گئی۔ (سورۃ بقرہ ۱۸۳)

رمضان المبارک کے ماہ بھر کے روزوں کے بعد تمام روزے نفل ہو گئے۔ جی چاہے رکھے جی چاہے نہ رکھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر روزے رکھا کرتے تھے رمضان کے علاوہ شعبان میں سب سے زیادہ، محرم کی نویں دسویں کو، چاندنی راتوں میں یعنی ہر ماہ کی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں کو۔ ان کے علاوہ دوسرے دنوں میں بھی رکھا کرتے تھے۔ شوال میں کسی وقت بھی آپؐ نے چھ روزوں کو سال بھر روزے رکھنے کے برابر قرار دیا۔ سوائے پانچ دنوں یعنی عید الفطر اور ذوالحجہ کی دس تا تیرہ تاریخوں کے مسلمان کسی دن بھی روزہ رکھ سکتے ہیں۔

(۳) زکوٰۃ:

نماز کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں زکوٰۃ اور فی سبیل اللہ انفاق اور صدقہ کا حکم شروع ہی سے دیا تھا۔ مکہ مکرمہ میں زکوٰۃ صدقہ کی رقم مقرر نہ تھی۔ مدینہ منورہ میں ۹ھ ۶۳۱ء میں باقاعدہ سالانہ زکوٰۃ مقررہ شرح سے ہر صاحب نصاب عاقل بالغ مسلمان پر ادا کرنی فرض قرار دی گئی۔ اس کا ذکر اوپر حاصل اور نظام مالیات کے ضمن میں آچکا ہے۔ زکوٰۃ تو اللہ کا فرض حق ہے اور صرف یہی مال مسلم میں الہی حق نہیں بلکہ اس کے علاوہ دوسرے صدقات و خیرات بھی ضروری حق ہیں، اگرچہ وہ اصطلاح میں سنت ہیں۔ جیسے عید الفطر کے دن صدقہ فطر، محتاج، محروم اور سائل کے لئے صدقات، بیواؤں، یتیموں اور دوسرے کمزوروں اور خاص کر رشتہ داروں میں غریب لوگوں کی مدد، پڑوسی کی مالی مدد وغیرہ۔ یہ بھی ضروری حقوق و فرائض ہیں۔

حج بیت اللہ:

اسلام کا چوتھا رکن حج ہے جو ۸ھ ۶۳۰ء میں فتح مکہ کے بعد فرض ہوا۔ ہر مسلمان پر جو مکہ مکرمہ جانے آنے اور گھر سے اپنی غیر حاضری کے دوران گھر والوں کے ضروری اخراجات کی رقم رکھتا ہو اور راستے بھی پر امن ہوں اور صحت ٹھیک ہو تو زندگی بھر میں ایک بار حج کرنا فرض ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے بعد صرف ایک حج کیا تھا جو ۱۰ھ ۶۳۲ء

میں ادا کیا گیا، اور جو حجتہ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔

حج ۸/۱۲ ذوالحجہ کے پانچ دنوں میں ہوتا ہے۔ اس کے دواہم رکن میں: اول طواف زیارت جو خانہ کعبہ کے گرد سات چکروں کی صورت میں دس تا بارہ تاریخ کو کسی وقت کیا جاسکتا ہے اور دوسرا ۹ تاریخ کو عرفات میں زوال کے بعد کسی وقت قیام۔ حج میں قربانی بھی کی جاتی ہے اور جو لوگ حج کو نہیں جاتے وہ دس کو عید الاضحیٰ کی نماز پڑھ کر قربانی کرتے ہیں وہ صاحب نصاب لوگوں پر واجب ہے۔

سال بھر میں حج کے پانچ دنوں کو چھوڑ کر کسی وقت عمرہ کیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے آنے کے بعد چار عمرے کئے۔ احرام باندھ کر خانہ کعبہ کا طواف اور مردہ و صفا کے درمیان سعی (دوڑنے) کے دو کام عمرہ کے رکن ہیں۔ عمرہ سنت ہے۔

اگرچہ اسلام کے ارکان میں جہاد کو عام طور سے شامل نہیں کیا جاتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ جہاد ہر حال میں ضروری ہے۔ اس کا مطلب صرف تلوار اور جنگ و جدال تک محدود نہیں۔ وہ تو جہاد کی ایک قسم ہے۔ مال دولت، قلم، کتاب، سعی و کوشش غرض کہ ہر ذریعہ سے اسلام کی سر بلندی، دین کے غلبہ اور شریعت کے نفاذ کی کوشش کرنا جہاد میں شامل ہے۔

شریعت اسلامی:

شریعت اسلامی میں عام طور سے پورا اسلام داخل ہے۔ لیکن کبھی کبھی فرق کرنے کیلئے قوانین کے حصے کو شریعت سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ فقہاء نے شریعت میں عبادات، معاملات اور عقوبات و جنایات (سزاؤں) کو شامل کیا ہے۔

قوانین:

اسلام نے انسانی زندگی کے ہر گوشہ اور اس کا ہر کام کیلئے قانون بنائے ہیں جن کا ماننا عبادات کی طرح ضروری ہے۔ ان پر عمل کیے بغیر مسلمان کا اسلام ادھورا رہتا ہے۔ شادی، طلاق، رضاعت، موت، تجارت، زراعت، صنعت، مزدوری سیاست، سماج اور اقتصاد، غرضیکہ ہر میدان اور شعبہ حیات سے اس کا تعلق ہے۔

قوانین میں کچھ کا تعلق حلال و حرام سے ہے یعنی کچھ کام جائز ہیں اور کچھ ناجائز۔ بعض قوانین کچھ کاموں کو مکروہ یا ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں اور بعض کو مباح و جائز۔ بعض کو پسندیدہ اور بہتر بتاتے ہیں۔

اخلاق و معاملات:

انسان کے انسان سے معاملات و تعلقات کو عام طور سے معاملات یا اخلاق کے عام لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عقائد و عبادات کا تعلق انسان اور اس کے خالق و مالک کے درمیان ہوتا ہے۔ جب کہ شریعت دونوں تعلقات یعنی بندہ اور اللہ تعالیٰ اور بندہ اور بندہ کے تعلقات کی جامع ہے۔ معاملات میں انسان کا اپنے جیسے انسانوں سے ہی واسطہ ہوتا ہے اور یہ اسلام کا بہت ہی حسین اور جامع پہلو ہے جو فرد و سماج کی صحت کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور دنیا میں انسان کی فلاح و سعادت بھی قائم کرتا ہے۔

اسلام کا یہ باب کئی اہم حقوق و فرائض پر مشتمل ہے۔ ان میں والدین، اولاد، میاں بیوی، رشتہ داروں، پڑوسیوں، بیواؤں، یتیموں، حاجتمندوں، مہمانوں، بیماروں اور جانوروں وغیرہ کے حقوق و فرائض بھی شامل ہیں۔ ایک کا حق دوسرے کا فرض اور دوسرے کا فرض پہلے کا حق ہے۔ ان کو ادا کیے بغیر اسلام کامل نہیں ہو سکتا۔

ان حقوق و فرائض کا احساس اور ان کو ادا کرنے کا فریضہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک مسلمان اللہ تعالیٰ اور انسان سے محبت و تعلق نہ پیدا کرے۔ عبادات و عقائد کے علاوہ بعض فضائل اخلاق اس کیلئے ضروری ہیں۔

ان میں صبر و توکل، شکر و قناعت، صدق و سچائی، سخاوت و فیاضی عفت و پاک بازی، امانت و دیانت، شرم و حیا، رحم و کرم، عدل و انصاف، عہد و وعدہ کی پابندی، حلم و بردباری، احسان و اکرام، غفور و درگزر، نرمی و لطف، تواضع و خاکساری، ایثار و اظہار، اعتدال و میانہ روی، عزت نفس و خودداری، شجاعت و بہادری، استقامت و حق گوئی، استغنا و بے پرواہی اور خوش کلامی و خندہ روی جیسے اخلاق پیدا کرنے ضروری ہیں۔

ان کے مخالف یا متضاد رذائل یا برے کاموں اور بد اخلاقی سے بچنا بھی ضروری ہے۔
 جیسے جھوٹ، کمر فریب، خیانت و دغا بازی، وعدہ خلافی و بد عہدی، بہتان و الزام تراشی، غیبت
 و بد گوئی، بدگمانی، ظمن و گمان، چغل خوری مداحی و خوشامد۔ حرص و طمع، بخل و کنجوسی، بے ایمانی اور
 ہجوری، رشوت و حرام خوری، ہضمہ، گرمی، بغض و کینہ، ظلم و زیادتی، فخر و غرور، خود بینی و خود نمائی،
 ریاکاری و پٹاوت، حسد و جلن، بدکلامی و فحش گوئی، فضول خرچی و اسراف وغیرہ۔ اخلاق کے ان
 دونوں مثبت و منفی پہلوؤں سے ہی ایمان کامل ہوتا ہے۔

حیات طیبہ کے آخری برس

فتح مکہ کے بعد اسلامی ریاست و معاشرہ کی تعمیر، شریعت و دین کی تکمیل اور دین و دنیا کی جامعیت پیدا کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا وقت گزرا۔

غزوہ کے بعد جب سارے عرب نے آپؐ کا دین اور اسلامی ریاست کا سیاسی اور مذہبی بالادستی قبول کر لی تو آپؐ نے مسلمانوں کو ان کے اصل مرکز خانہ کعبہ پر جمع کرنے کی غرض سے اللہ کے حکم سے حج اکبر کا اعلان کیا۔ ذوالحجہ ۹ھ ۶۳۱ء میں آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق کو امیر حج بنا کر بھیجا اور تمام مسلمانوں نے ان کی امارت میں حج کیا۔ اسی موقع پر حضرت علی ابن ابی طالب نے آپؐ کے نمائندے کی حیثیت سے سورہ توبہ کے احکام لوگوں کے سامنے پیش کیے۔

ان میں سب سے اہم یہ تھا کہ کافروں اور مشرکوں کو ہمیشہ کیلئے بیت اللہ کے قریب آنے سے روک دیا گیا اور ان کو اپنے کفر و شرک کی گندگی دور کر کے اسلام میں داخل ہونے کی چار ماہ کی مہلت دی اور اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں مکہ مکرمہ چھوڑ دینے کا حکم دیا۔

حجۃ الوداع:

اگلے سال ۱۰ھ ۶۳۲ء میں آپؐ نے اپنا اسلام کا پہلا اور آخری حج کیا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے مگر اس کا اصل نام حجۃ الاسلام ہے۔ آپؐ کے ساتھ ایک اندازے کے مطابق ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمانوں نے حج کیا۔ ان کے علاوہ بہت سے مسلمان اپنے گھروں میں

رہے اور حاضر نہیں ہو سکے اندازہ ہے کہ پانچ اور دس لاکھ کے بیچ مسلمانوں کی کل آبادی اس وقت تک ہو گئی تھی آپؐ کی تمام ازدواج مطہرات نے بھی آپؐ کے ساتھ یہ آخری حج کیا۔

خطبہ حجتہ الوداع:

اس حج اکبر کے دوران آپؐ نے مختلف مقامات پر کئی خطبے دیئے جن میں مسلمانوں کو بہت اچھی اچھی نصیحتیں کیں۔ یہ نصیحتیں ایسے شخص کی تھیں جو اب رخصت ہونے والا تھا۔ خطبہ حجتہ الوداع میں آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی توحید، مسلمانوں کی بلا امتیاز رنگ و علاقہ مساوات تقویٰ کی فضیلت، جاہلیت اور جاہلی رسوم اور فخر و مباہات سے اجتناب مسلمانوں کی اخوت غلاموں اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک، خون جاہلیت کے خاتمہ، اور ربا و سود کی حرمت، خون و مال مسلم کی عزت و حرمت، مکہ مکرمہ کی فضیلت و تقدس، کتاب الہی اور سنت نبویؐ سے تمسک، وراثت کے احکام، عورت و مرد کے حقوق، اپنی رسالت اور تبلیغ اسلام کے فریضہ کی ادائیگی پر زور دیا۔ یہ سارے خطبات پڑھنے کی چیزیں ہیں اور ہر مسلمان کیلئے ضروری لائحہ عمل بتاتے ہیں۔

اسی وقت دین مکمل ہوا اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ جب اللہ کی فتح و نصرت آجائے اور لوگ دین میں داخل ہونے لگیں تو اللہ کی جناب میں توبہ و استغفار کرو۔ یہ آپؐ کی وفات کے قریب آنے کا اعلان تھا۔ (سورہ نصر)

بیماری اور وفات:

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ واپس آنے کے دو ماہ بعد آپؐ بیمار ہوئے۔ سارے رخصتی کے کام کیے۔ طاقت رہی تو مسجد جا کر نماز پڑھاتے رہے۔ جمعرات ۸ ربیع الاول ۱۱ھ کی نماز مغرب مسجد میں آپؐ کی آخری نماز تھی۔ آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق کو نماز پڑھانے کا حکم دیا جنہوں نے آپؐ کی زندگی میں سترہ نمازیں پڑھائیں۔ آپؐ کی بیماری بڑھتی ہی گئی۔ دو شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو دن چڑھے آپؐ اپنے اللہ سے جا ملے۔ اللہم بالرفیق الاعلیٰ۔ مسلمانوں کو شدید غم ہوا۔ دوسرے دن منگل ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ کو آپؐ کو حضرت عائشہ کے حجرہ میں جہاں آپؐ کی وفات ہوئی تھی، دفن کیا گیا۔ آپؐ کا روضہ مبارک مسجد نبوی کے درمیان مشرقی سمت میں واقع ہے۔

ازواج مطہرات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچیس سال کی عمر شریف سے لے کر پچاس برس کے سن تک صرف ایک بیوی حضرت خدیجہ کے ساتھ زندگی انتہائی خوشی و مسرت کے ساتھ بسر کی۔ انھیں سے آپؐ کی تمام اولادیں ہوئیں، سوائے حضرت ابراہیم کے۔ حضرت خدیجہ کی مکہ مکرمہ میں وفات کے بعد مختلف اسباب سے کئی شادیاں کرنی پڑیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپؐ کو چار سے زیادہ شادیاں کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے۔ جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل نہیں۔ (سورہ اجزاب ۵)

۱۔ حضرت سودہ عامری:

ہجرت سے تین سال قبل پہلے آپؐ نے حضرت سودہ بنت زمعہ عامری سے شادی کی تاکہ گھر کی اور بچوں کی دیکھ بھال ہو سکے اور حضرت سودہ کی دلجمعی ہو جائے کیوں کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے بچوں کو بھی دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اس شادی سے قریش کے خاندان بنو عامر بن لوی سے آپؐ کا رشتہ استوار و مضبوط ہو گیا۔ حضرت سودہ کا حضرت عمر کی خلافت میں انتقال ہوا۔ (ذوالحجہ ۲۳ھ / اکتوبر۔ نومبر ۶۴۳ھ)

۲۔ حضرت عائشہ تیمی:

اسی برس حضرت عائشہ بنت ابی بکر صدیق تیمی سے آپؐ نے نکاح کیا۔ رخصتی ہجرت کے بعد شوال ۱ھ میں ہوئی جب عائشہ کی عمر نو سال تھی۔ وہ آپؐ کے ساتھ نو سال رہیں اور پینتالیس سال بیوگی کے گزارے۔ ۵۷ھ / ۶۷۱ء میں حضرت معاویہ کی خلافت میں ان کی وفات ہوئی۔ اس شادی میں دین و دنیا کی بہت سی مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ اپنے خلیل و دوست

حضرت ابوبکر صدیق سے دوستی اور تعلق کی مضبوطی اور ان کے اعزاز و اکرام کے علاوہ دین و شریعت کی تبلیغ حضرت عائشہ کے ہی علم و فضل کے سبب زیادہ تر ہوئی کہ وہ نہ صرف ذہین و فطین تھیں بلکہ ان کی عمر پچی تعلیم کی اصل زندگی تھی۔ باقی ازواج مطہرات پکی عمر میں آئی تھیں۔

۳۔ حضرت حفصہ عدوی:

جس طرح ابوبکر صدیق سے آپؐ نے تعلقات مستحکم کئے تھے۔ اسی طرح آپؐ نے اپنے دوست حبیب حضرت عمر سے روابط کی مضبوطی اور ان کے اعزاز و اکرام کیلئے آپؐ نے ان کی بیوہ صاحبزادی حضرت حفصہ سے ۳ھ ۶۲۵ء میں شادی کی۔ وہ انتہائی نیک، پرہیزگار اور عبادت گزار ہونے کے علاوہ علم والی تھیں ۴۵ھ ۶۶۵ء میں انتقال کیا۔

۴۔ حضرت زینب ہلالی:

حضرت زینب بنت خزیمہ ہلالی سے ان کے شوہر حضرت عبداللہ بن جحش کی وفات کے بعد ۴ھ میں نکاح کیا۔ وہ فقراء و مساکین کی ماں (ام المساکین) کہلاتی تھیں کہ بہت خیرات کرتی تھیں مگر دو تین ماہ کے بعد ہی ان کی وفات ۴ھ ۶۲۶ء میں ہو گئی۔

۵۔ حضرت ام سلمہ مخزومی:

حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ مخزومی سے آپؐ نے ان کے شوہر کے انتقال کے بعد ۴ھ میں نکاح کیا۔ اس نکاح کے ذریعہ آپؐ نے اپنے رضاعی بھائی عبدالاسد مخزومی کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کی اور قریش کے ایک اہم خاندان اور اس کے ایک اہم سردار سے تعلق مضبوط کیا۔ ان سے بھی بڑا علم و فضل پھیلا کہ وہ بڑی عالمہ تھیں۔ ان کی وفات سب سے آخر میں یعنی خلافت یزید بن معاویہ میں ۶۱ھ ۶۸۰ء یا اس کے دو تین سال بعد ہوئی۔

۶۔ حضرت زینب اسدی:

۵ھ ۶۲۷ء میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی شادی حضرت زینب بنت جحش اسدی سے کر دی۔ وہ آپؐ کی پھوپھی زاد بہن ہونے کے علاوہ آپؐ کے لے پالک حضرت زید بن حارثہ کی بیوی رہ چکی تھیں۔ اس شادی سے لے پالک بنانے اور اس کی متعلقہ رسوم کی کاٹ کی گئی۔ وہ

انتہائی سخی، فیاض، عابدہ، زاہدہ اور نیک تھیں۔ ان کی وفات ۲۰ھ ۶۴۱ء میں ہوئی۔

۷۔ حضرت جویریہ خزاعی:

اسی برس آپؐ نے حضرت جویریہ بنت حارث خزاعی سے بنوالمصطلق کی جنگ کے بعد شادی کی۔ اس شادی سے پورا قبیلہ بنوالمصطلق مسلمان ہو گیا اور ان کے تمام قیدیوں کو آزادی ملی۔ وہ بہت عابد و نیک اور بزرگ خاتون تھیں ۵۰ھ ۶۷۱ء میں خلافت معاویہ میں ان کی وفات ہوئی۔

۸۔ حضرت ام حبیبہ اموی:

۷ھ ۶۲۹ء میں آپؐ نے مکہ مکرمہ کے عظیم ترین شیخ و سردار حضرت ابوسفیان بن حرب اموی کی دختر حضرت ام حبیبہ سے ان کے شوہر عبید اللہ بن جحش کے حبشہ میں نصرانی ہونے کے بعد شادی کی۔ آپؐ کا غائبانہ نکاح بخاشی حبشہ نے پڑھایا اور مہر کی رقم ادا کی۔ پھر وہ مدینہ آ کر آپؐ کے ساتھ تین چار برس رہیں۔ اس شادی سے بنو امیہ اور مکہ کے اہم سردار سے تعلقات استوار ہوئے۔ ۴۴ھ ۶۶۲ء میں انہوں نے اپنے بھائی حضرت معاویہ کی خلافت کے زمانے میں وفات پائی۔

۹۔ حضرت صفیہ نضری:

غزوہ خیبر کے بعد ۷ھ میں ہی آپؐ نے اس کے ختم ہونے کے فوراً بعد حضرت صفیہ بنت حنی نضری سے شادی کی۔ وہ یہودی تھیں لیکن اسلام لے آئیں۔ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ اس طرح یہودی قبائل سے آپؐ کے تعلقات استوار ہوئے۔ حضرت صفیہ نے ۵۰ھ ۶۷۱ء میں وفات پائی۔

۱۰۔ حضرت میمونہ:

آپؐ کی آخری اہلیہ حضرت میمونہ بنت حارث ثقفی ہیں جن سے آپؐ نے فتح مکہ کے بعد ۸ھ ۶۳۰ء میں نکاح کیا۔ قبیلہ ثقیف سے تعلقات سدھارنے میں اس نکاح نے کافی اہم کردار ادا کیا۔ ۵۱ھ ۶۷۱ء میں آپؐ کی وفات مقام سرف میں ہوئی اور

مکہ میں دفن کیا گیا۔ باقی ازواج مطہرات مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

۱۱۔ حضرت خدیجہ

گیارہ ازواج مطہرات بشمول حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کے نکاح میں تاعمر رہیں۔ ان میں سے حضرت خدیجہ کی وفات ہجرت کے قبل مکہ میں ہی ہو گئی اور ہجرت کے بعد حضرت نسیب ہلالی (ام المساکین) اپنی شہداء کے صرف دو تین ماہ بعد وفات پا گئیں۔ باقی نو ازواج مطہرات آپ سے بعد بھی کافی دنوں زندہ رہیں اور امت کی ماؤں کی حیثیت سے اسلام کی خدمت کرتی رہیں۔ آپ کی سب سے آخر میں وفات پانے والی زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ مخزومی ہیں۔ جو خلافت یزید بن معاویہ میں واصل بحق ہوئیں۔ ان تمام ازواج مطہرات میں سے صرف حضرت خدیجہ سے آپ کی اولادیں ہوئی، باقی تمام ازواج لا ولد رہیں۔ رسول اکرم کی ایک باندی ماریہ قبطیہ تھیں جن سے آپ کے ایک فرزند حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ اس طرح وہ بھی آپ کی ایک بیوی تھیں۔ روایات کے مطابق آپ نے بعض اور خواتین سے بھی نکاح کیا مگر وہ مکمل نہیں ہوا۔ اس لیے آپ کی ازواج مطہرات کی کل تعداد گیارہ اور حضرت ماریہ سمیت بارہ ہے۔

اولاد:

مکی دور حیات میں آپ کی اولاد کا ذکر آچکا ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ آپ کے دو صاحبزادے حضرت قاسم اور حضرت ابراہیم تھے۔ ان میں سے حضرت ابراہیم ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے جو آپ کی باندی تھیں اور تحفہ و ہدیہ میں مقوقس مصر کی طرف سے آئی تھیں۔ ان کے سوا تمام اولادیں حضرت خدیجہ کے بطن سے تھے۔ حضرت ابراہیم ۸ھ/۶۳۰ء میں پیدا ہوئے اور سوا دو ماہ کے بعد انتقال کر گئے۔

آپ کے فرزند اکبر حضرت قاسم بھی بچپن میں انتقال کر گئے تھے۔ باقی فرزندوں کے بارے میں اختلافات ہیں۔ لیکن بیٹا کوئی زندہ نہیں رہا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ آپ کسی مرد کے باپ نہ رہیں۔ اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ (سورہ احزاب ۴۰)

آپ کی چار بیٹیاں تھیں جن کی پیدائش کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ بعد کی زندگی کیلئے مختصر

تفصیلات یہ ہیں۔

۱۔ حضرت زینب:

آپؐ کی بڑی بیٹی حضرت زینب تھیں۔ ان کی شادی حضرت خدیجہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی بہن حضرت ہالہ کے فرزند ابوالعاص بن زبج عبد شمس کے ساتھ کی تھی۔ ان سے دو اولادیں ایک لڑکا حضرت علی اور ایک لڑکی حضرت امامہ پیدا ہوئیں۔ ان سے آپؐ کو بہت محبت تھی۔ حضرت زینب کا انتقال ۸ھ / ۶۳۰ء میں آپؐ ہی کی زندگی میں ہو گیا۔

۲۔ حضرت رقیہ:

دوسری دختر حضرت رقیہ کی شادی آپؐ نے حضرت عثمان بن عفان اموی سے ہجرت حبشہ سے پہلے کی۔ دونوں میاں بیوی نے حبشہ اور مدینہ کی دونوں ہجرتیں کیں۔ غزوہ بدر کے دوران ۲ھ / ۶۲۴ء میں حضرت رقیہ کی اچانک وفات ہو گئی۔ حضرت عثمان کے ان سے ایک فرزند حضرت عبداللہ تھے۔

۳۔ حضرت ام کلثوم:

حضرت رقیہ کے بعد آپؐ نے اپنی تیسری دختر حضرت ام کلثوم کی شادی حضرت عثمان اموی سے کر دی۔ چھ سال شوہر کے ساتھ رہیں۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ۹ھ / ۶۳۱ء میں آپؐ کی زندگی ہی میں ان کی وفات ہو گئی۔ حضرت عثمان کو اسی بنا پر ذوالنورین (دونوروں والا) کہا جاتا ہے۔

۴۔ حضرت فاطمہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری بیٹی حضرت فاطمہ کی شادی حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی سے ۲ھ / ۶۲۴ء میں ہوئی۔ ان سے حضرت علی کے تین فرزند حضرت حسن (۳ھ / ۶۲۵ء)، حضرت حسین (۴ھ / ۶۲۶ء) اور حضرت محسن (۶ھ / ۶۲۸ء) اور دو دختر حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم پیدا ہوئیں۔ ان سے حضرت علی کی نسل خوب چلی۔ حضرت فاطمہ کی وفات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد ہو گئی (رمضان ۱۱ھ / دسمبر ۶۳۲ء)۔

سیرت طیبہ پر ایک مجموعی نظر

یہ حقیقت ہے کہ انسانوں کی سیرت و کردار کی تعمیر و ترقی انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں اور ان کے لائے ہوئے پیغامات کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ تمام انبیاء کرام چونکہ ایک محدود قوم، علاقے اور زمانہ کی ہدایت و رہنمائی کیلئے مبعوث ہوئے تھے، اس لیے ان کا اثر بھی وقتی، عارضی اور محدود رہا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کیلئے نبوت کے بعد سے قیامت تک کیلئے تمام زمانوں کے لیے مبعوث کیا۔ اس لیے صرف آپؐ کو سیرت اور آپؐ کا لایا ہوا پیغام عالمگیر اور دائمی ہے۔ اس کا ایک تاریخی ثبوت یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ہر اہم اور ضروری جزئیہ محفوظ ہے اور آپؐ کا لایا ہوا اسلام پوری طرح سے محفوظ و موجود ہے۔

دوسرے انبیاء کرام کی سیرتوں کے صرف بعض پہلو معلوم ہیں۔ بہت سوں کے صرف نام ہی معلوم ہیں اور کچھ پتہ نہیں اور نہ جانے کتنے انبیاء کرام ایسے ہیں جن کے نام تک ہی معلوم ہیں۔ اسی طرح ان کی لائی ہوئی کتابیں، ان کے قوانین، ان کے عبادات و احکام بھی یا تو معلوم نہیں یا ان کے صرف چند پہلوؤں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ پھر دوسرے انبیاء کرام کسی ایک اخلاق عالی یا مجموعہ اوصاف کے پیکر تھے۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمام فضائل اخلاق کے پیکر اور مجسم رحمت تھے۔ آپؐ کی تاریخت، آپؐ کی جامعیت، آپؐ کی دین و دنیا اور جسم و روح کی ہمہ گیر اور آدرش و عمل کی امتزاجیت ہی آپؐ کا عالمگیر اور دائمی اسوہ اور نمونہ بناتی ہے

اسی لیے آپؐ ختم المرسلین ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دینی اور مادی انقلاب برپا کیا تھا اس کے اثرات آج تک باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے۔ مکہ مکرمہ کے تیرہ سالہ نبوی قیام کے دوران آپؐ نے اسلام کی فکری اور عقائدی بنیادیں رکھیں اور مضبوط کیں۔ اسی کے ساتھ عملی زندگی کے اہم اصولوں اور عبادات کی تکمیل کی۔ بعد میں مدنی زندگی کے دس سالہ دور میں عبادات و اخلاق اور شریعت کی تکمیل کی اور ایسی تکمیل کہ اب انسانیت کی تعمیر و تشکیل اور ترقی کیلئے کسی اور پیغام اور فکر و نظام کی ضرورت نہیں۔ باقی سارے فکر اور عملی نظام کھوٹے ہیں اور صرف اسلام کا فکری اور عملی نظام کھرا ہے۔

تیس برس کی قلیل مدت میں آپؐ نے جو انقلاب برپا کیا اس کے بعض اہم پہلو حسب ذیل ہیں۔
۱۔ آپؐ نے دین کا وہ نظام پیش کیا جو انسان کے جسم و روح اور دینا و آخرت کی ہر ضرورت پورا کرتا ہے۔ وہ ایسا دین فطرت ہے جو بشریت کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور فطری ہے۔ اس لیے ہر سچے دل اور ہر سوچنے والے دماغ کی واحد پناہ گاہ ہے۔

۲۔ آپؐ نے ایک ایسا سماجی انقلاب برپا کیا اور ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جس میں انسانی سطح پر کوئی اونچ نیچ نہیں۔ مسلم اخوت اور انسانی احترام کی بنیادوں پر اسے استوار کیا۔ انسانوں کو ہر طرح کے استحصال و ظلم اور جبر سے نجات دلائی جس میں سب کے مساوی اور انصاف پر مبنی حقوق و فرائض ہیں۔ پیدائش، خاندان، علاقہ، رنگ و نسل اور زبان وغیرہ جیسی چیزوں کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان فرق نہیں روارکھا۔ افضلیت اور برتری کا معیار تقویٰ، خشیت الہی اور نیک اعمال کو بنایا۔ اولین مسلمانوں میں آپؐ نے قوت، اتحاد، اخوت، مساوات، تنظیم اور مرکزیت پیدا کی۔ بکھرے شیرازہ کو جمع کر کے ان کو عظیم سماجی قوت بنا دیا۔

۳۔ اسلام نے وہ معاشی اور اقتصادی نظام قائم کیا جس کا بنیادی اصول ہے کہ کسی کو نقصان نہ پہنچے بلکہ سب کو فائدہ ہو۔ معاشی مساوات کا اصول و تصور نہیں پیش کیا۔ بلکہ عدل و انصاف پر مبنی نظام قائم کیا کیوں کہ رزق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ساتھ ہی دولت کے ایک جگہ جمع ہونے کو روکا اور اس کو مسلسل گردش میں رکھا۔

مالداروں کے مال میں محتاجوں محروموں اور بہت سے لوگوں کا حق رکھا۔ دولت کے لالچ اور حرص کے راستے بند کیے اور ہمدرد اور غمگساری کے طریقے ضروری قرار دیئے۔ اس سے معاشی خوشحالی اور انصاف و امان پیدا ہوا۔

۴۔ چوتھائی صدی سے کم مدت میں آپؐ نے جو فکری نظام قائم کیا تھا، اس کی بنیاد پر دس سال سے کم مدت میں وہ سیاسی نظام قائم کیا جس نے پورے جزیرہ نمائے عرب کے ہزاروں مربع میل پر وسیع اسلامی ریاست قائم کی۔ وہ بھی ایسے قبائلی عربوں کے ذریعہ جو مرکزیت، تنظیم اور اتحاد کے تصورات سے نا آشنا تھے۔

یہی وہ مرکزیت، تنظیم اور اتحاد تھا جس نے اسلامی ریاست کو ایسی سیاسی قوت بنا دیا جس کا مد مقابل پورے عرب میں نہ تھا جس میں اتنی سیاسی طاقت تھی کہ اس نے عہد نبویؐ میں اپنے وقت کی سب سے بڑی سلطنت روم کو لکارا اور چند برسوں بعد دو میں سے ایک عظیم ترین سلطنت..... ساسانی سلطنت ایران..... کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور دوسری عظیم ترین سیاسی قوت..... سلطنت روم یا بزنطین..... کا شیرازہ منتشر کر دیا کہ وہ آہستہ آہستہ زوال پذیر ہو گئی اور بالآخر وہ ایک مسلمان فاتح کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچی۔

۵۔ اگرچہ فوجی نظام کے بیان میں ضروری نکات آچکے ہیں۔ تاہم یہاں یہ نکتے بیان کرنا ضروری ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر کہ جہاد کیلئے ہر طرح کی قوت اور خاص کر شہسواروں کی طاقت جمع کی جائے پر پوری طرح عمل کیا تھا۔ آپؐ نے شروع سے محسوس کر لیا تھا کہ جلد یا بدیر قبائل عرب بالخصوص قریش مکہ اور یہودیوں سے طاقت آزمائی ضرور ہو گئی۔ اس لیے آپؐ نے افرادی اور اسلحہ جاتی طاقت مجتمع کرنی شروع کر دی اور شہسواری کے فروغ اور گھوڑوں کو جمع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ پہلی جنگ اسلام یعنی غزوہ بدر میں تین سو تیرہ سپاہیوں، ناکامی اور ٹوٹے پھوٹے اسلحوں اور دو گھوڑوں سے بڑھ کر آخری غزوہ نبویؐ..... تبوک..... میں تیس ہزار کا لشکر جرار، کافی اور عمدہ اسلحہ اور دس ہزار گھوڑے جمع کر لیے۔ یہی فوجی طاقت تھی جس نے دشمنان اسلام کے دلوں میں بقول الہی خوف و دہشت پیدا کی اور جس نے بعد میں ممالک اور سلطنتیں فتح کیں۔

۶۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اہم، عالمگیر اور ابدی کارنامہ تہذیبی میدان خاص کر علوم و فنون کے میدان میں ہوا تھا۔ یہ بہت اہم بحث ہے۔ اس لیے اس کو مختلف عنادین کے تحت الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) تعلیم و تعلم:

اسلام سے پہلے عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا۔ وہ ان پڑھ اور ان گڑھ لوگ تھے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ”امیین“ کہا ہے۔ مکہ مکرمہ جیسے عظیم ترین مرکز دین محور تہذیب میں چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان ہے کہ پورے عرب میں خواہ وہ شہری قبیلے ہوں یا بدوی لوگ لکھنے پڑھنے کا عام رجحان پیدا ہوا اور عام مسلمانوں نے بھی ضروری لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ قرائت اور کتابت کے فنون کے ارتقاء کے ساتھ علوم و فنون کی ترقی شروع ہوئی جو دن رات بڑھتی ہی گئی۔

(ب) تدوین قرآن مجید کریم:

عام تعلیم کے فروغ میں سب زیادہ حصہ قرآن مجید نے لیا۔ جس کی پہلی نازل ہونے والی آیت ”اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ“ نے قرائت (پڑھنے) قلم (لکھنے) اور علم پر زور دیا تھا۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات کریمہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان گنت احادیث مقدمہ میں علم سیکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے ان دونوں ارشادات پر پوری طرح عمل کیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لئے پہلے خود قرآن مجید کی ایک ایک آیت یاد کر کے سینے میں محفوظ کرتے اور مسلمانوں کو حفظ کراتے۔ اس طرح جتنا قرآن مجید نازل ہوتا وہ سینوں میں محفوظ ہو جاتا۔ نمازوں میں اس کی قرائت نماز کے باہر تلاوت اور حضرت جبریل کے ساتھ قرآن منزل کا دورہ اس کی حفاظت و حفظ کی پکی ضمانت بن گیا۔

پھر آپؐ نے ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید کی کتاب اور لکھنے کا اہتمام بھی کیا مکہ مکرمہ کے ابتدائی دور سے ہی آپؐ قرآن شریف کے نازل شدہ حصے مختلف صحابہ کرام کے ذریعہ مختلف چیزوں پر لکھوا دیتے تھے۔ اس طرح پورا نازل شدہ قرآن کریم برابر کم و کاست لکھا بھی جاتا

رہا۔ مدینہ منورہ میں بھی یہی سلسلہ چلتا رہا اور قرآن کی ہر آیت و سورت لکھی گئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت پورا قرآن مجید تحریری شکل میں محفوظ اور موجود تھا۔ البتہ آپؐ نے ایک مصحف یا کتاب کی شکل میں ایک جمع نہیں کراوایا تھا۔

لیکن آپؐ کے متعدد صحابہ کرام کے اس نے نسخے یا مصاحف اپنے آپؐ جمع کر لیے تھے۔ ایسے صحابہ کرام کو ”جماع القرآن“ کہا جاتا ہے۔ عہد نبوی میں مدینہ میں چھ حضرات زیادہ مشہور و معروف تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے جامع قرآن تھے جن کے اپنے نسخے اور مصاحف تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن مسعود کے مصحف میں ستر سورتیں ایسی تھیں جن کو انہوں نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھ کر لکھا تھا۔

(ج) تفسیر و علوم قرآن:

اگرچہ عہد نبوی میں باقاعدہ تفسیر یا علوم قرآن کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی لیکن ان علوم و فنون کی ابتداء آپؐ ہی سے ہوئی۔ تفسیر و علوم قرآن پر مشتمل بہت سی روایات احادیث نبوی کی زبانی ترسیل میں شامل تھیں۔ متعدد قرآن آیات کی تفسیر اور علوم قرآن پر مشتمل چیزیں آپؐ نے از خود اپنی زبان مبارک سے لوگوں کو بتائی تھیں۔ اور بہت سے صحابہ کرام نے آپؐ سے پوچھ کر لوگوں تک پہنچائی تھیں۔

پھر صحابہ کرام نے آپس میں ایک دوسرے سے تفسیری استفادہ کیا اور علوم قرآنی پر بحث کی اور بعد میں دوسری نسل تک ان کو پہنچایا۔ بعض صحابہ کرام جیسے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرات ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت وغیرہ کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ انہوں نے اپنے قرآن مصاحف میں تفسیری اور علمی نکات بھی لکھ لیے تھے۔ ان میں قرأت و تجوید و نسخ وغیرہ کے نکات تھے۔

(د) علوم حدیث:

قرآن مجید کی افہام و تفہیم اور دین اسلام کی شروح و تعبیر کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت ضروری تھی۔ حدیث میں چار چیزیں شامل کی جاتی ہیں۔ (۱) قول (بات)

(۲) عمل و فعل (کام) (۳) تقریر (کسی بات یا کام پر آپؐ کی خاموشی جو رضامندی کے مترادف تھی) اور (۴) آپؐ کے شامل یا حلیہ وغیرہ۔

قرآن کریم، حدیث نبوی اور تاریخ اسلامی کی ان گنت روایات سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزار باتیں بیان کیں، اور ان گنت کام کئے۔ آپؐ کی حدیث و سنت بھی اللہ کے یہاں سے آتی تھی۔ کیوں کہ جو کچھ آپؐ فرماتے تھے وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں فرماتے یا کرتے تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم و ارشاد سے کرتے تھے۔ اسی بنا پر آپؐ کی احادیث کو غیرہ متلو وحی یا قرآن (بلا تلاوت والی وحی یا قرآن) کہا جاتا ہے کہ آپؐ معصوم تھے اور گناہ و غلطی سے محفوظ۔

احادیث نبوی قرآن مجید کی تشریح و تعبیر کرتی ہیں۔ وہ دین اسلام کا دوسرا اہم ترین ذریعہ علم ہیں۔ احادیث نبوی کو مانے بغیر اسلام ادھورا اور نامکمل رہ جاتا ہے احادیث کی روایت و ترسیل اسی مذہبی اور علمی غرض سے پہلے پہل ہوئی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجلسوں، گھروں، راستوں اور ہر مقام و جگہ پر صحابہ کرام سے کچھ نہ کچھ ارشاد فرمایا یا کوئی نہ کوئی کام کیا بلکہ لوگوں کو تاکید کی کہ آپؐ کی خلوت و جلوت کے ہر کام کو آپؐ کی ہر بات کو بیان کیا جائے اور لوگوں تک بلا کتر بیونت پہنچایا جائے۔ چنانچہ اس ارشاد کی بنا پر بھی لوگوں نے آپؐ کی احادیث دوسروں تک پہنچایا جائے۔

پھر لوگوں کو آپؐ سے حد درجہ محبت تھی۔ اس لیے وہ آپؐ کی ہر بات اور ہر کام کو جاننا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے خود بھی ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور احادیث کی ترسیل و ابلاغ کا کام ہوتا رہا۔ آپؐ کی شکل و صورت، شامل و حصائل اور عادات و اطوار سے بھی لوگوں کو دلچسپی تھی اور نہ صرف صحابہ کرام بلکہ غیر مسلموں کو بھی۔ اس شامل اور حلیہ وغیرہ کا علم اور روایت پھیلی۔

عہد نبوی کے زمانے میں زیادہ تر حدیث و سنت زبانی بیان کی گئی مگر تحریری مجموعے بالکل عنقائے تھے۔ آپؐ نے خود بھی بہت سی چیزیں لکھوائیں جیسے خطبہ فتح مکہ اور خطبہ الوداع کے بعض حصے لوگوں کو لکھو کر دیئے۔ بہت سے احکام و فرامین گورنروں اور والیوں کو لکھوائے۔ قریش سے

معاہدہ صلح حدیبیہ اور دوسرے لوگوں سے کے گئے معاہدے لکھوائے۔ سلاطین عرب و عجم کو اسلام کی دعوت دینے کیلئے نامے لکھوائے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی تحریریں آپؐ نے لکھوائیں..... یہ سب حدیث کا حصہ ہیں۔

آپؐ کے متعدد صحابہ کرام جیسے عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی وغیرہ نے اپنے حدیث کے مجموعے تحریری شکل میں تیار کر لیے تھے اور بعض نے ان کو آپؐ کے سامنے پڑھ کر ان کے مضامین کی تصدیق بھی کرائی تھی۔ ان مجموعوں کو صحیفے کہا جاتا ہے۔ ایک جدید تحقیق کے مطابق کم از کم پچاس صحابہ کرام نے ایسے حدیثی صحیفے لکھ کر رکھے تھے۔

(س) فقہ:

عہد نبوی میں قرآن مجید اور حدیث نبوی دینی مسائل کے حل کیلئے کافی تھے اور انھیں دونوں پر فقہ اسلامی مبنی تھی لیکن بحیثیت ایک فن کے اس کا ارتقاء یا کم از کم اس کا آغاز اسی زمانہ میں ہوا۔ صحابہ کرام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ہر نئے مسئلہ اور ہر نئی صورت حال میں اسلامی تعلیم آپؐ سے پوچھ کر جان لیتے تھے مگر آپؐ کی غیر موجودگی میں ان کو قرآن و سنت پر مبنی اپنی رائے و فکر سے بھی کام لینا ہوتا تھا مگر آپؐ کی غیر موجودگی میں ان کو قرآن و سنت پر مبنی اپنی رائے و فکر سے بھی کام لینا ہوتا تھا۔ مثلاً حضرت معاذ بن جبل خزرجی کو جب آپؐ نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو فرمایا: تم اہل کتاب لوگوں کے پاس جا رہے ہو وہ اگر کوئی مسئلہ پوچھیں تو کیسے فیصلہ کرو گے۔ انہوں نے عرض کیا کہ قرآن کریم کی روشنی میں فرمایا اگر تمہیں قرآن سے وہ حل نہ ملے تو؟ عرض کیا آپؐ کی سنت سے۔ فرمایا اگر اس میں بھی وہ حل نہ ہو تو؟ عرض کیا پھر میں اپنی رائے اور اجتہاد سے کام لوں گا۔ آپؐ نے ان کے فیصلے اور رائے کو پسند فرمایا اور اس طرح فقہ اسلامی کا تیسرا اصول قیاس وجود میں آیا۔

فقہ اسلامی کا چوتھا اصول..... اجماع..... بھی برتا گیا کہ آپؐ نے مسلمانوں کے مشورہ سے اذان کی صورت اور الفاظ متعین فرمائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے بعض صحابہ کرام کو خاص طور سے فتویٰ دینے پر مامور فرمایا اور ان کی خاص تربیت کی۔ چنانچہ حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی، عبدالرحمن بن عوف، معاذ بن جبل اور زید بن ثابت وغیرہ ایسے صحابہ مفتیوں میں شامل تھے۔

(ص) سیرت و تاریخ:

ان دونوں علوم کا آپس میں گہرا تعلق ہے، اسلامی تاریخ کا آغاز سیرت نبوی سے ہوا اور سیرت عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں حدیث کا حصہ رہی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل اور جمع کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ اس میں اسلامی تاریخ بھی تھی اور سیرت بھی۔ پھر آن مجید کتاب ہدایت ہونے کے باوجود معاصر عہد نبوی کا بہت سا تاریخی مواد رکھتا ہے۔ وہ بھی اسلامی تاریخ کا ایک اہم بلکہ اہم ترین ماخذ ہے۔ عہد نبوی میں سیرت و تاریخ کی کوئی کتاب مرتب نہیں کی گئی کیوں کہ ایک تو یہ دونوں علوم قرآن و حدیث سے الگ نہ ہوئے تھے۔ دوسرے قرآن کے مصاحف اور حدیث کے صحیفے سیرت و تاریخ کے کام سمجھے جاتے تھے۔ تیسرے اس زمانے میں سیرت و تاریخ کی روایتیں زبانی ہی ایک دوسرے سے نقل کی جاتی تھیں۔

(ط) دوسرے علوم و فنون:

عہد نبوی کے بنیادی علوم تو صرف دو قرآن و حدیث تھے۔ انھیں سے فقہ، سیرت اور تاریخ نکلے اور بعد میں علیحدہ علوم کی شکل میں ارتقاء پذیر ہوئے۔ لیکن بعض دوسرے علوم و فنون بھی اس دور میں شروع ہوئے اگرچہ وہ ابتدائی دور کے اور ثانوی اہمیت کے تھے مثلاً ریاضی اور حساب کافن پہلے سے عرب میں موجود تھے۔ حضرت زید بن ثابت وغیرہ نے علم الفرائض (میراث کے حصوں کے علم) کے ذریعے اس کو ترقی اور رواج دیا۔

حضرت زید بن ثابت نے آپؐ کے حکم و اجازت سے سیریانی اور عبرانی زبانیں سیکھیں بعض اور زبانیں بھی وہ جانتے تھے۔ حضرت عمر فاروق نے تورات کا علم حاصل کیا اور اس کو پڑھا سیکھا۔ بعض دوسرے صحابہ بھی سابقہ کتب سادی کے عالم تھے۔ یہودی و نصرانی علماء جیسے حضرت

عبداللہ بن سلام وغیرہ نے اس فن اور اس کی زبان کو مسلمانوں میں مزید رواج دیا۔ اس دور میں فن تعمیر کا بھی ارتقاء ہوا۔ وہ سادہ اور معمولی تھا۔ مدینہ منورہ میں مکانات نبوی اور مسجد نبوی جیسی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ بعض صحابہ کرام کے مکانات دو منزلہ تھے۔ ایک صحابی نے اپنا مکان قبہ نما بنایا تھا۔ مدینہ منورہ کے لوگ موسیقی اور گانے کے بھی شوقین تھے۔ اس فن نے اسلامی حدود میں کافی ترقی کی۔ غرض کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی تہذیب و تمدن کی اصل داغ بیل ڈالی اور اس کو قبائلی سطح سے اٹھا کر شہری اور سکونتی سطح تک بلند کیا۔ آپ کی قائم کردہ بنیادوں ہی پر بعد میں اسلامی تہذیب نے اپنی شناخت بنائی۔

تاریخ اسلام

عہد جاہلیت سے عہد نبوی تک

پروفیسر محمد حسین مظہر صاحب